7380

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادب و تنقید نمبر ۱

پاکستان کے تہذیبی مسائل

ذخیرۂ محمد اقبال مجددی لاہور

ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایم-اے، پی ایچ ڈی
پروفیسر و صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی
پرنسپل
یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

ادارۂ ادب و تنقید ۰ لاہور

136089

تصنیف ——— پاکستان کے تہذیبی مسائل

مصنف ——— ڈاکٹر عبادت بریلوی

سرورق ——— سیّد انور حسین نفیس رقم

کتابت ——— امان اللہ قادری

طباعت ——— مطبع عالیہ لاہور

ناشر ——— ادارۂ ادب و تنقید لاہور

تاریخ اشاعت ——— ۱۹۷۹ء

قیمت ——— بیس ۲۰ روپے

فہرست

136089

پیش لفظ ۵

(۱)

پاکستانی تہذیب کا مسئلہ ۱۱

(۲)

پاکستان کے تعلیمی مسائل ۱۹

(۳)

اُردو ـــــ پاکستان کی قومی زبان ۲۹

اُردو زبان کے جدید رجحانات ۶۱

اُردو پر مغرب کے اثرات ۷۵

اُردو زبان کی موجودہ صورتِ حال ۸۵

(۴)

تخلیقی عمل کا المیہ ۹۱

اُردو ادب کی موجودہ صورتِ حال ۱۰۳

پاکستانی ادب ۱۰۷

(۵)

ادیب اور موجودہ ادبی صورتِ حال ۱۲۳

ادیبوں کے مسائل ۱۲۷

پاکستانی معاشرہ اور ادیب ۱۳۵

پیش لفظ

اسلامیان ہند نے اس برعظیم ہند و پاکستان میں تقریباً ایک ہزار سال کے عرصے میں جو تہذیب پیدا کی، وہ انسانیت کی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس تہذیب نے علم و تعلیم، زبان، ادب و شعر، مصوری، موسیقی، فن تعمیر، غرض زندگی کے ہر شعبے میں جس تخلیقی مزاج کا اظہار کیا ہے تاریخ کے صفحات اس سے روشن نظر آتے ہیں۔ بعض چیزیں تو اس سرزمین کے مسلمانوں نے ایسی تخلیق کیں کہ انھوں نے خود تہذیب کو چار چاند لگا دیے، اور یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض کا شمار آج دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔

برعظیم کے مسلمانوں نے اپنے ان تہذیبی کارناموں پہ ہمیشہ فخر کیا، اور اس سرمائے کو محفوظ کرنے کا خیال ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ ان تہذیبی مظاہر پر اسلام اور اسلامی روایات کی گہری چھاپ تھی۔ ظاہر ہے کہ غیر مسلم، مسلمانوں کے ان تہذیبی کارناموں سے دلچسپی کا اظہار کیسے کر سکتے تھے۔ وہ تو ان کو اپنی شکست اور مفتوح ہونے کی نشانیاں تصور کرتے رہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ان تہذیبی مظاہر کو پس منظر میں ڈالنے کے لیے پراچین کال اور پراچین بھارت کی تہذیب کو واپس لانے کے لیے ایسی مذہبی اور سیاسی تحریکیں نہ چلائی جاتیں۔ جنھوں نے تہذیبی تصادم کا ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جو اس برعظیم کی تہذیبی تاریخ میں ایک اچھا خاصا میدان کارزار نظر آتا ہے۔

پاکستان کے تصوّر کی تخلیق میں اس صورتِ حال کا بڑا ہاتھ ہے اور قیام پاکستان کی تحریک میں بعض دوسرے عوامل کے ساتھ، یہ پہلو بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ مُتحدہ ہندوستان میں نظامِ تعلیم کو جس طرح شُدھ کرنے کی کوشش کی گئی، اردو کی جگہ جس طرح سنسکرت آمیز ہندی کو رائج کرنے کے منصوبے بنائے گئے اور ادب و شعر کو جس طرح پرچین بھارت کے تہذیبی سانچے میں ڈھالنے کی طرف رجحان ظاہر کیا گیا، اس نے اسلامیانِ ہند کو حیران و پریشان کر دیا، اور وہ بالآخر اپنے اس عظیم تہذیبی سرمائے کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ چنانچہ کسی نہ کسی صورت میں کئی سو سال تک اس جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار اس جنگ میں مسلمانوں کی فتح قیام پاکستان کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔

یہ ملک اسلامیانِ ہند نے اس لیے حاصل کیا کہ یہاں اسلام کا صحیح ماحول ہو۔ اس میں اسلامی اقدار فروغ پا سکیں اور ان کی تہذیب و ثقافت، جس پر اسلام کی گہری چھاپ ہے، اس سرزمین میں پروان چڑھ سکے۔

اس احساس و خیال کو پاکستان میں کس حد تک عملی صورت دی گئی، اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ ان سب کے نشیب و فراز کی تفصیل اس کتاب میں مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور جو صورتِ حال گزشتہ تیس سال میں ہمارے ہاں پیدا ہوئی ہے یا جس کے آئندہ پیدا ہونے کے امکانات ہیں اس کے مُثبت اور منفی پہلوؤں کو تجزیاتی انداز میں نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس وقت ہمارے اس وطنِ عزیز میں نظامِ تعلیم کی جو کیفیت ہے، اس کے علم برداروں کا جو حال ہے، قومی زبان جن حالات سے دوچار ہے، ادب کا جو نقشہ ہے اور ادیبوں پر جو کچھ گذر رہی ہے، اس کے مطالعے سے اس کی بہت سی تصویریں آنکھوں کے سامنے ضرور آ جاتی ہیں۔ اور یہی اس کتاب کی تالیف و ترتیب اور طباعت و اشاعت کا مقصد ہے۔

گزشتہ تیس سال میں ہم نے اپنے جگر لخت لخت کو جس طرح جمع کرنے کی کوشش کی ہے تعمیر اور حسرتِ تعمیر کا جو عمل ہماری تہذیبی و ثقافتی زندگی کے

مختلف شعبوں میں جاری رہا ہے۔ ہم نے جو کچھ پایا ہے اور جو کچھ کھویا ہے، اور آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے، ان تمام پہلوؤں کو اس کتاب میں مُثبت اور تعمیری زاویۂ نظر سے دیکھنے کو کوشش کی گئی ہے۔ اس خیال سے کہ اس عمل کا سلسلہ جاری رہے جس کے لیے ہم نے اس وطن عزیز کی تعمیر و تشکیل کی تھی۔ اور جس میں اُن اقدار کو فروغ دینے کا بیڑہ اٹھایا تھا جو برِ عظیم کی اسلامی تہذیب میں بُنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کے بغیر ہمارا وجود خطرے میں نظر آتا ہے۔

عبادت بریلوی

اورینٹل کالج لاہور
۱۶/اگست ۱۹۷۸ء

||

پاکستانی تہذیب کا مسئلہ

آج کل کلچر اور تہذیب کے مختلف مسائل پر جو بحثیں ہوتی ہیں، ان سے باتیں کچھ اور بھی اُلجھ جاتی ہیں اور بحث کرنے والے کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے۔ پاکستان میں بھی کلچر اور تہذیب کے معاملات میں یہی کچھ ہوا ہے۔ چنانچہ کلچر اور تہذیب کے معاملات و مسائل میں جو انتشار اس وقت ہمارے ہاں پایا جاتا ہے شاید ہی دُنیا کے کسی دوسرے ملک میں پایا جاتا ہو۔ آج اس موضوع پر بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی ہیں اور ایسے مُتضاد افکار و خیالات پیش کئے جارہے ہیں جنہوں نے تہذیب اور کلچر کے تصوّر کو ایک خوابِ پریشاں بنا دیا ہے۔

اس صورت حال کا بُنیادی سبب یہ ہے کہ ہم میں سے بیشتر نے پاکستان کی تحریک اور اس کی تاریخ کو بُھلا دیا ہے۔ ہم نے اس نظریے اور آئیڈیالوجی سے آنکھیں پھیر لی ہیں جو اس تحریک کی بُنیاد تھا۔ ہم اس نظامِ فکر اور اندازِ حیات سے بدکنے لگے ہیں جس نے قیامِ پاکستان کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اب تو ہم میں سے بیشتر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ پاکستان صرف ایک خطّہ زمین کا نام ہے جو جغرافیائی اعتبار سے اپنی بعض خصوصیات رکھتا ہے اور جس کی جھلکیاں اس زمین کے مختلف علاقوں کے افراد میں نظر آتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ تصوّر صحیح نہیں ہے۔ پاکستان کی تحریک تو ان خیالات و نظریات

کے سائے میں پروان چڑھی تھی کہ برعظیم کے مسلمان ایک قوم ہیں۔ یہ قوم اپنی کچھ خصوصیات رکھتی ہے جو اس برعظیم میں بسنے والے دوسرے افراد سے مختلف ہیں۔ ان خصوصیات کو ان دینی عقائد نے پیدا کیا ہے، جن کو ان افراد نے ہمیشہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا ہے اور جن کے نتیجے میں اس برعظیم کے مسلمانوں میں ایک مخصوص نظام اخلاق، ایک مخصوص نظام معاشرت، ایک مخصوص نظام افکار اور ایک مخصوص جذباتی نظام قائم ہوا ہے۔ ہم آئے دن یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک ایسے فرد کا رویہ جو توحید کا قائل ہو، عشق رسولؐ سے سرشار ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے شعل راہ سمجھتا ہو اس کا پورا رویہ اس شخص سے مختلف ہوتا ہے جو توحید پر ایمان نہیں رکھتا اور عشق رسولؐ سے سرشار نہیں ہوتا۔

پاکستان کی تحریک کا خیال ہی ہمارے دلوں میں اس رویے کی حفاظت کے خیال اور احساس نے پیدا کیا۔ اسی لیے میں تو یہ کہتا ہوں کہ پاکستان کی تحریک در حقیقت بنیادی طور ایک دینی تہذیبی اور ثقافتی تحریک تھی۔ اس تحریک کو مجبوراً سیاست کا سہارا لینا پڑا اس لیے کہ مخالفین کی سیاست کا جواب سیاست ہی سے دیا جا سکتا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے جو کچھ کہا، سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اپنے عمل سے جو کچھ کر دکھایا، سر سید احمد خاں نے جو تصورات پیش کیے اور علامہ اقبالؒ نے جو خواب دیکھے وہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں، اور ان سب کا محور خیال یہی ہے کہ برعظیم کے مسلمانوں کا ایک مخصوص انداز فکر اور نظام حیات ہے اور اس مخصوص نظام فکر اور انداز حیات کو بہر صورت پروان چڑھنا چاہیئے۔ اس کی حفاظت تمام اسلامیان ہند پر فرض ہے اور اس کام کے لیے انہیں ایسی زمین چاہیئے جہاں وہ آزادی اور بے باکی کے ساتھ کام کر کے اس کو پروان چڑھا سکیں۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ نے اس کے لیے ایک آزاد اور خود مختار مملکت کے قیام کا خواب دیکھا، اور قائد اعظم نے اپنی بصیرت اور عملی کاوش سے اس کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اور اس طرح اس خواب نے حقیقت کا روپ اختیار کر لیا۔

پاکستانی کلچر کے بارے میں علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے خیالات بہت واضح

ہیں۔ انہیں اس حقیقت کا شدید احساس تھا کہ اسلامیان ہند نے اس برعظیم میں ایک عظیم کلچر کو پیدا کیا ہے۔ جس کے ایک ایک انداز اور ایک ایک پہلو پر اسلام کی گہری چھاپ ہے۔ ہندوؤں نے اس کلچر کو ملیامیٹ کرنے کے منصوبے بنائے اور پراچین بھارت کے کلچر کو ایک دفعہ پھر زندہ کرنے کی کوشش کی۔ آریہ سماج کی تحریک شدھی اور سنگھٹن کے اقدامات، ہندی کے روپ میں سنسکرت کو زندہ کرنے کی کوششیں، ان سب کی تہہ میں برعظیم سے مسلمانوں کے کلچر اور تہذیب و ثقافت کو مٹانے اور اس کے مقابلے میں پراچین کال کے پرانے ہندو کلچر اور سنسکرتی کو عام کرنے کا خیال تھا۔ ہندوستان کی گذشتہ ایک صدی کی سیاسی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ اس خیال کو صحیح ثابت کر سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم نے بہت جلد اس تاریخ کو بھلا دیا۔

کشمیر سے راس کماری تک اور پشاور سے ڈھاکہ تک بنیادی طور پر مسلمانوں کا کلچر ایک تھا۔ اس کلچر کی بنیاد اسلام اور اس کے بنیادی اصول تھے۔ وہ دینی عقائد تھے جن کی شمعیں اسلام اور خصوصیت کے ساتھ اسلامی تصوّف نے افراد کے دلوں میں فروزاں کی تھیں۔ اسی صورت حال نے ہر علاقے کے مسلمانوں کو ایک رشتے میں منسلک کیا اور ان کے لباس، رہن سہن کے طور طریقے، فکری روّیے، جذباتی تقاضے، اخلاقی معیار، سب میں ایک یگانگت اور مماثلت پیدا کی۔

اُردو زبان اس کلچر کی سب سے بڑی مظہر تھی۔ اسی لیے تو ہندوؤں نے اس کی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا اور اس کی جگہ ہندی کو عام کرنے کی کوشش کی۔ اسی لیے تو قائدِ اعظمؒ اور بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے گاندھی جی سے لڑائی تک مول لی اور ہندی اُردو کی ایک جنگ اس برعظیم میں تقریباً نصف صدی تک جاری رہی۔ اسی لیے تو گاندھی جی بالآخر یہ کہنے کے لیے مجبور ہوئے کہ "ہم اُردو کو تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ یہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور اس پر اسلام کی گہری چھاپ ہے۔" اس لیے تو قائدِ اعظم نے خود آخری عمر میں قیامِ پاکستان سے قبل اُردو سیکھی اور اس زبان میں تقریریں بھی کیں۔ اور پھر قیام

پاکستان کے بعد واضح طور پر اعلان کیا کہ "پاکستان کی قومی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی "
افسوس کی بات ہے کہ قیام پاکستان کے بعد پاکستانیوں نے قائدِ اعظم کے ان الفاظ کو بھلا دیا اور اس زبان کو وہ اہمیت نہیں دی جو اس کو ملنی چاہیئے تھی۔ پاکستانی کلچر کی شیرازہ بندی اس کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ جس قوم کے پاس زبان نہ ہو وہ کلچر کی شیرازہ بندی بھلا کس طرح کر سکتی ہے۔ ؟ آج جو اس سلسلے میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں،، اس کی وجہ یہی ہے کہ پاکستانی کلچر کی شیرازہ بندی کا خیال ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے اور ہم کسی اور چکّر میں پھنس گئے ہیں۔

پاکستان حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت میاں میرؒ، حضرت بابا فرید شکر گنجؒ، حضرت خواجہ بہاؤ الدین زکریاؒ، حضرت بابا بُلھے شاہ اور حضرت سلطان باہوؒ کی سرزمین ہے۔ ان بزرگوں نے اپنے قول و عمل سے اس سرزمین کے افراد میں توحید اور عشقِ رسولؐ کے تصورات سے عظمتِ انسان، انسانیت اور انسان دوستی کے جو رویّے پیدا کیے وہ اس سرزمین کے افراد کی شخصیت اور کردار کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ان ہی رویّوں سے اس سرزمین کا انسان پہچانا جاتا ہے اور یہی اس کے کلچر کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ان بزرگوں نے اپنے پیغامات فارسی، اُردو، پنجابی اور سندھی کے ذریعے عوام تک پہنچائے اور یہ زبانیں ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں۔ ایک زمانے تک ان خیالات اور رویّوں کے اظہار کی زبان فارسی رہی۔ پھر اُردو نے اس کی جگہ لے لی۔ پنجابی اور سندھی اُردو سے مختلف زبانیں نہیں ہیں۔ اسی لیے تو ان بنیادی خیالات کا اظہار ان زبانوں میں بھی ہوتا رہا۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا ان بزرگوں کے تصورات و نظریات کا تعلق حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور ایسے ہی صوفیا سے نہیں ہے جن کا فیض برِعظیم کے ہر علاقے میں عام ہے۔ دراصل یہ سب کے سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں جنہوں نے افراد میں ایک ایسے کلچر کو عام کیا جس کو بجا طور پر کے ساتھ برِعظیم کا اسلامی کلچر کہا جا سکتا ہے۔ سیاسی تبدیلیاں یقیناً کلچر کو متاثر کرتی ہیں۔ لیکن ان

بزرگوں کا پیدا کیا ہوا کلچر آج بھی سیاست پر حاوی ہے اور ان کے پیدا کئے ہوئے کلچرل یا تہذیبی روّیے آج بھی روشنی کے مینار نظر آتے ہیں اور ان کی روشنی دُور دُور تک پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

فارسی اور اُردو کے جو شاعر اس برِعظیم میں پیدا ہوئے ہیں، اور جنہوں نے اپنی تخلیقات سے اسلامی کلچر کو فروغ دیا ہے، ان کے ہاں ان ثقافتی رویّوں کی چھاپ بڑی گہری ہے۔ حضرت امیر خسروؒ، ولی، حضرت خواجہ میر دردؒ، میر تقی میر، غالب اور مومن کو اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی قائم کی ہوئی تہذیبی و ثقافتی روایت ہمارے کلچر اور تہذیب کا بنیادی حصّہ ہیں۔ ہمارے خون میں اس روایت کا رنگ ہے اور ہم چاہیں بھی تو اس سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے۔ اس لیے ان شعرا کا صرف شکریہ ادا کرنے سے ہمارا کام نہیں چلے گا۔ ہمیں تو ان کی ثقافتی روایات کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا ورنہ تہذیب اور کلچر کا سارا شیرازہ منتشر ہو جائے گا، اور ہم اپنے آپ کو زمین کی بجائے خلا میں محسوس کریں گے۔

یہ صحیح ہے کہ جغرافیائی حالات کے اثرات کلچر پر گہرے ہوتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کلچر میں زمین کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تاریخ، عقائد، افکار و خیالات کو بھی اس کی تعمیر اور تشکیل میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اگر ہم پاکستانیوں نے ان کو نظر انداز کر دیا تو ایک ایسا ذہنی و فکری انتشار پیدا ہوگا جو تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے خودکشی کا باعث ہو سکتا ہے۔

ایک ملک، اس میں شبہ نہیں، کہ مختلف علاقوں سے مِل کر اپنی صورت اختیار کرتا ہے۔ لیکن اس میں وحدت کا خیال لازمی ہے۔ علاقائی زبانوں اور تہذیبوں کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ یہ علاقائی زبانیں اور ثقافتیں ملکی اور قومی ثقافت کو سہارا دیتی ہیں اور ان کے فروغ کا باعث بنتی ہیں۔ اس لیے ان کو نظر انداز کرنا بھی نادانی ہے۔ عربی، فارسی اور اردو سے ہمارا ثقافتی رشتہ بہت گہرا ہے اور اردو جو ہماری قومی زبان ہے عربی اور فارسی زبانوں سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اس میں اسّی فیصد الفاظ عربی اور فارسی کے ہیں۔

اس لیے اُردو اس برعظیم کے مسلمانوں کی قومی اور ثقافتی زبان ہے۔ اس پر اسلام کی گہری چھاپ ہے۔ یہی وہ زبان ہے جو پاکستان کے ہر علاقے میں نہ صرف بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ عام طور پر لکھنے کے لیے استعمال بھی کی جاتی ہے۔ وہ جُزوی طور پر دفتری اور سرکاری زبان بھی ہے۔ آیئن میں اس کو قومی زبان کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اس لیے وہ پاکستان کی ثقافتی شیرازہ بندی اور سیاسی استحکام کی بہت بڑی نشانی ہے۔ اس کو فروغ دینا اور آگے بڑھانا پاکستانی کلچر کی شیرازہ بندی کا عمل ہے۔ لیکن علاقائی زبانوں کی اہمیت اس عمل سے مجروح نہیں ہوتی۔ علاقائی زبانوں کا فروغ بھی لازمی ہے۔ کیوں کہ علاقائی زبانیں اور ثقافتیں قومی زبان اور ثقافت کو سہارا دیتی ہیں۔ اس لیے کہ ان کا تعلق اُردو سے بڑا گہرا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ اسی زبان کی مختلف اور رنگا رنگ صورتیں ہیں جن کو مقامی رنگ اور علاقائی روایات نے انفرادیت سے ہمکنار کیا ہے۔ ان سب علاقائی زبانوں کے پاس تخلیق ادب کی عظیم روایت ہے جو اُردو کی عظیم روایت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ثقافتی اعتبار سے ہمارے ہاں نئی زندگی کو پیدا کر سکتی ہے۔ اس کے لیے منصوبہ بندی ضروری ہے۔ لیکن یہ منصوبہ بندی ایک زاویۂ نظر ایک قومی شعور اور زندگی کی اعلیٰ اور ارفع قدروں کے احساس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

پاکستان ایک عظیم ملک ہے، اور اس میں رہنے والے افراد ایک عظیم قوم ہیں۔ ان کی تہذیب بھی عظیم ہے کیونکہ اس کے پیچھے صدیوں کی تاریخ ہے، صدیوں کے انسانی، اخلاقی اور فکری رویّے ہیں۔ ان سب کو اپنے کلچر کی صورت میں برقرار رکھنا، ان کو فروغ دینا اور آگے بڑھانا ہر پاکستانی کا فرض ہے۔ لیکن یہ فرض اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک نظر میں وسعت اور دلوں میں کشادگی پیدا نہ ہو۔

آج پاکستانی قوم کو اسی وسعت نظر اور کشادہ دلی کی ضرورت ہے کیونکہ تہذیب اور کلچر کا پودا انہی کے سایے میں پنپتا اور پروان چڑھتا ہے۔

پاکستان کے تعلیمی مسائل

پاکستان کے تعلیمی مسائل

قیام پاکستان سے لے کر اس وقت تک تعلیم اور نظام تعلیم سے متعلق ہمارے ہاں سوچا تو بہت کچھ گیا ہے، منصوبے تو بہت کچھ بنائے گئے ہیں، دعوے تو بے شمار کئے گئے ہیں، لیکن اس وطن عزیز کی گذشتہ تیس سال کی تاریخ تعلیم یہ بتاتی ہے کہ ان پر جس طرح عمل کرنا چاہیئے تھا، اس طرح عمل نہیں کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تعلیم کی دنیا میں ان خیالات اور منصوبوں کے مثبت نتائج برآمد نہیں ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اپنے نظام تعلیم کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم نے جہاں سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا، ہم وہیں کھڑے ہیں۔

پرائمری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک آجکل اعداد و شمار کم و بیش وہی ہیں جو آج سے تیس سال قبل تھے۔ پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ اور اعلیٰ تعلیم تو ڈھائی فی صد سے زیادہ نہیں بڑھ سکی ہے۔ حالانکہ گذشتہ تیس سال میں نئے تعلیمی ادارے بھی قائم ہوئے ہیں، نئے کالج بھی کھلے ہیں، نئی یونیورسٹیاں بھی بنی ہیں۔ اور تعلیم کو عام کرنے اور پھیلانے کے بلند بانگ دعوے بھی کئے گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیمی اداروں میں طالب علموں کی تعداد کچھ بڑھی ضرور ہے لیکن جس اعتبار سے آبادی میں اضافہ ہوا ہے، اس کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ اضافہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تعلیمی اداروں کا ماحول بہتر ہونے کی بجائے روز بروز خراب ہوتا گیا ہے۔ تعلیم کی طرف توجہ جس طرح ہونی چاہیئے تھی، نہیں ہو سکی ہے، اساتذہ

ظاہر ہے کہ یہ سب کے سب کسی نہ کسی اعتبار سے طالب علم بھی رہے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں وہ کام کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا جو اساتذہ کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ ان بزرگوں نے فکری، تہذیبی اور اخلاقی سطح پر جو کام کیا ان کو ہماری قوم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ حالات حد درجہ ناسازگار تھے۔ انحطاط و زوال نے ہمارے معاشرے اور ماحول پر پر پھیلا رکھے تھے۔ حالات نے ذہن و فکر تک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔ خیالات تک کو بیڑیاں پہنا دی گئی تھیں۔ لیکن سرسیدؒ کی علمی سرگرمیاں اور قائد اعظم اور علامہ اقبالؒ کی فکر و عمل کی تابانیاں انہیں حالات میں پروان چڑھیں اور اپنے اپنے وقت پر تاریخ میں انہوں نے قوم کی تعمیر کی اور آزادی کی جدوجہد کو تیز سے تیز تر کیا۔ یہاں تک کہ ہم اس منزل پر پہنچ گئے، جس کو آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آزادی نے ہمیں جو پاک وطن دیا، اس کی تعمیر میں ہمارے مفکروں کی فکر کا لہو ہے۔ یہ لہو اس کی رگ رگ میں دوڑتا نظر آتا ہے۔ قاعدے کی بات تو یہ ہے کہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں اور خصوصاً تعلیمی اور علمی ماحول میں، اساتذہ اور طلبا کے کردار اور فکر و عمل میں اس لہو کا رنگ کچھ زیادہ ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن اس پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہم میں سے بیشتر کا زاویۂ نظر مادّی ہو گیا۔ ہم دولت کے پیچھے بھاگنے لگے، سازشوں میں الجھ گئے، اور ہم نے یہ سمجھ لیا کہ تن کی دنیا ہی سب کچھ ہے، من کی دنیا کی نہ تو کوئی ضرورت ہے نہ اہمیت۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ منافقت عام ہو گئی۔ ہر انسان کے کئی چہرے ہو گئے۔ فکر و عمل میں مطابقت باقی نہ رہی۔ مثبت زاویۂ نظر مفقود ہو گیا۔ وطن سے محبت، معاشرے کی بہبود کا خیال، نصب العین سے پیار صرف خیالوں میں باقی رہ گیا۔ اور ہم صرف دکھانے کے لیے اس کی باتیں کرتے رہے۔ منافقت تعمیر کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ تعمیر تو درکنار وہ تو حسرت تعمیر تک کو پنپنے نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ کئی سال سے ہمارے معاشرے میں نمود و نمائش کا ماحول قائم ہو گیا ہے۔ مادہ پرستی بڑھ گئی ہے۔

136089

اونچا طبقہ سب سے پہلے اس کا شکار ہوا۔ پھر اس کی دیکھا دیکھی دوسرے طبقوں، خصوصاً متوسط اور نچلے متوسط طبقوں میں بھی یہی ماحول پیدا ہو گیا اور وہ بھی اس رنگ میں رنگ گئے۔ جن لوگوں کو اس پر عمل کرنے کے مواقع نہ مل سکے وہ خیالوں میں اس ماحول کی دنیا میں بسلنے لگے۔ چنانچہ معاشرہ ایسے مذمومات کی دلدل میں پھنس گیا، جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، آپ سب جانتے ہیں، اور آئے دن آپ کو معاشرے میں ایسے تجربات ہوتے ہیں جنہوں نے زندگی کو ہمارے لیے اجیرن بنا دیا ہے

(۳)

تعلیمی ماحول معاشرے کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اگر اس کی بنیادیں صحیح قدروں پر استوار ہوں تو وہ معاشرے کو بدل بھی دیتا ہے، اس میں انقلاب بھی لے آتا ہے لیکن یہ صورت حال اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ذہن بیدار ہوں، اور معاشرے میں کوئی ذہنی اور فکری تحریک موجود ہو۔ زندگی کے مادّی زاویۂ نظر نے اس قسم کی کسی تحریک کو ہمارے یہاں پیدا نہیں ہونے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی ماحول وہ کام انجام نہ دے سکا جو اسے دینا چاہیئے تھا۔ اساتذہ تک کسی نہ کسی حد تک اس افسوسناک صورت حال کے شکار ہو گئے۔ ان میں سے بیشتر کا زاویۂ نظر بھی مادّی اور انفرادی ہو گیا۔ نفسی نفسی کی کیفیت، جو معاشرے میں تھی، اس میں وہ بھی رنگ گئے۔ انہوں نے تعلیم کے اس تصوّر کو فراموش کر دیا کہ وہ معاشرے کی اس کوشش کا نام ہے جو وہ اس لیے کرتا ہے کہ خود معاشرہ قائم رہے، اور جس نظریے اور نصب العین پر اس معاشرے کی بنیاد ہے، وہ برقرار رہے۔ اور افراد میں وہ صلاحیت پیدا ہو سکے کہ وہ اس نظریے کو برقرار رکھنے میں معاون ہوں، اس کی اہمیت کو جانیں، اس کے نشیب و فراز کو پہچانیں، اور اس کو آگے بڑھانے کے لیے سرگرم عمل رہیں۔ زندگی میں ہونے والی نئی تبدیلیوں کا احساس بھی ان کے پیش نظر ہو، اور وہ ان میں سے ایسی تبدیلیوں کو، جو ترقی پسندانہ اور صحت مندانہ ہیں، معاشرے کا جُزو بنا سکیں۔

ہمارے اساتذہ نے جُزوی طور پر تو تعلیمی ماحول میں یہ خدمت انجام دی ہے ،

لیکن وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مکمل طور پر یہ کام ان کے ہاتھوں انجام نہیں پا سکا ہے۔ حالانکہ نظام تعلیم اور اساتذہ کے نظام اخلاق میں اس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ وطن عزیز جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا، ایک نظریے اور نصب العین پر قائم ہوا۔ اسلام اور اسلامی اقدار کا فروغ، مسلمانوں کی ذہنی فکری، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی بلندی اس کے پیش نظر تھی۔ ہمارے اساتذہ کو شاید فکری اور نظری طور پر تو اس حقیقت کا احساس و شعور تھا لیکن عملی طور پر، جس طرح ان کو اس مقدّس کام میں شریک ہونا چاہیئے تھا، اس طرح وہ شریک نہ ہو سکے۔ معاشرے اور ماحول کی بگڑتی ہوئی کیفیت نے انہیں بھی ڈانوا ڈول کر دیا۔ بیشتر کے قدم ڈگمگا گئے۔ اور وہ ایک ایسے راستے پر چل دیے، جس پر چلنا ان کے شایان شان نہیں تھا۔

ایمان کی بات یہ ہے کہ استاد کو فقر و درویشی ہی زیب دیتی ہے۔ وہ خدمت اور محبت کے سہارے جیتا ہے اور انہی چیزوں کو اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ ہماری اسلامی روایت بھی یہی ہے۔ وہ اُستاد ہی کیا جو اپنے وطن سے، اپنے ماحول سے، اپنے معاشرے سے محبت نہ کرے اور خدمت کے جذبے سے سرشار نہ ہو۔ وہ صرف کتاب ہی نہیں پڑھاتا، علم ہی کو اپنے طالب علموں کے سینے میں نہیں اتارتا، اُن کی شخصیت اور کردار کی تعمیر بھی کرتا ہے۔ ان کی ذہنی نشو و نما میں بھی ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اور ان کو اچھا انسان بھی بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ایسے ہی اساتذہ انجام دے سکتے ہیں جن میں خود انسانی خوبیاں موجود ہوں اور جو انسانی زندگی کی اعلےٰ قدروں کے علم بردار ہوں، جو وطن سے پیار کرتے ہوں، جو عقیدے سے محبت رکھتے ہوں، جو نصب العین کو محترم جانتے ہوں، جو مادّی پہلوؤں کے مقابلے میں روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کو اہمیت دیتے ہوں اور جن کے مزاج میں فقر و درویشی کی خوشبو بسی ہوئی ہو، کیونکہ اخلاق اور نظام اخلاق کی بلندی کا کوئی تصور ان قدروں کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔

ہماری تعلیمی زندگی کا ایک المیہ یہ بھی رہا ہے کہ اس کی تنگ دامانی کے باعث

اچھے دماغ اور اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے افراد اس مقدس پیشے کی طرف کم متوجہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ جماعتوں تک اوسط درجے کی صلاحیتیں رکھنے والے افراد اس میں زیادہ داخل ہو گئے۔ اوسط درجے کے ذہن کے آدمی کے پاس تخیل نہیں ہوتا۔ وہ نہ کوئی بات سوچتا ہے نہ کوئی نئی بات کرتا ہے۔ تخلیقی عمل سے وہ محروم ہوتا ہے۔ صدق دلی سے کام کرنے کی لگن اس میں نسبتاً کم ہوتی ہے۔ وہ میکانکی انداز میں سوچتا اور عمل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلیم میکانکی عمل نہیں، بلکہ بنیادی طور پر ایک تخلیقی کام ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں ایسے اساتذہ کو بھی مادی طور پر جو کچھ حاصل ہوا تھا وہ نہ ہونے کے برابر ہے اب تو خیر حکومت نے اساتذہ کا مقام اس اعتبار سے خاصا بلند کر دیا ہے لیکن ذرا اس سے قبل کی تصویر دیکھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارے استاد کو اپنی محنت کا جو صلہ ملتا تھا، اس کے سہارے وہ معاشرے میں ایک اچھی زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ استاد اور اس کے مقام کو زر کے پیمانے سے ناپنا چاہیئے۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر استاد کے پاس رہنے کے لیے مکان نہیں ہوگا۔ پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہوں گے، کھانے کے لیے دال دلیہ نہیں ہوگا، تو ظاہر ہے کہ جو مقدس کام اس کے سپرد کیا گیا ہے وہ کوشش کے باوجود اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے گا۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہاں تعلیم میں یہی صورت حال پیدا ہوئی، اور ہم اس سے مسلسل متاثر ہوتے رہے ہیں۔

ہم نے جس اوسط درجے کا ذہن رکھنے والے استاد کے سپرد تعلیم کے ذریعے اپنے بچوں کو انسان بنانے کا کام سونپا، وہ اپنی مالی پریشانیوں کی وجہ سے اپنی منصبی مصروفیات میں پورا وقت نہیں دے سکا۔ اس نے اس کام کے علاوہ کچھ اور کام بھی کیا، اور اگر نہیں کیا ہے تو کم از کم یہ سوچا ضرور ہے کہ اس کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ کبھی اس نے پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کے لیے مزدوری کی ہے اخباروں میں، ریڈیو میں، ٹیلی ویژن میں، دفتروں اور ٹیوشن سنٹروں میں اس نے مختلف طریقوں سے کام کیا ہے۔ اس صورت حال نے اس کے

مزاج میں ایک کاروباری انداز بھی پیدا کر دیا ہے۔ اور اس کی نفسیات ایک ایسے انسان کی نفسیات بن گئی ہے جو ایک شکست خوردہ (FRUSTRATED) انسان کی ہوتی ہے۔ جو طلباء ایسے اساتذہ سے تعلیم حاصل کریں گے اور ان کا جو حشر ہوگا، اس کو بخوبی تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطنت روما کے زوال کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ارباب اختیار نے بچوں کی تعلیم و تربیت ایسے غلاموں کے سپرد کر دی تھی جو احساس کمتری کے مارے ہوئے تھے۔ ہم سے بھی بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے اپنے اساتذہ کو صرف چند سکوں کا مستحق سمجھا اور معاشرے میں ان کے مقام کو بلند کرنے کا خیال کسی کو نہیں آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن بچوں نے ان کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کی وہ خود معاشرے کے لیے اساتذہ ہی کی طرح ایک مسئلہ بن گئے۔

(۲)

شکست خوردہ نفسیات کا انسان معاشرے کے لیے بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا عمل متوازن نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کو سمجھتا نہیں۔ اس کو کسی سے محبت نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کی اعلیٰ و ارفع قدروں کا احساس نہیں رکھتا۔ اس میں کام کرنے کی لگن نہیں ہوتی۔ وہ اپنے احساس کمتری کو بعض اوقات احساس برتری میں ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً اگر ایسا اُستاد ابتدائی مدارج کے بچوں سے وابستہ ہے، تو عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ بڑا ہی جابر، ظالم اور سفّاک انسان ہوتا ہے۔ اپنی اہمیت جتانے کے لیے بچے کو بات بات پر سزا دیتا ہے، مارتا ہے، جسمانی اذیت پہنچاتا ہے، اور اس طرح بچے کو ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے تباہ و برباد کر دیتا ہے، اور اپنے آپ کو تو خیر تباہ کر ہی لیتا ہے۔ آپ اپنے اچھے سے اچھے اسکولوں میں (اور اچھے اسکول صرف گنتی کے ہیں۔ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے) جا کر دیکھیے، آپ کو وہاں ایک میدان کارزار گرم نظر آئے گا۔ جہاں ہر بچے کو استاد مجرم تصوّر کر کے اس کو بات بات پر اس طرح مارتا ہے کہ بعض اوقات خون کے فوارے تک چھوٹتے ہیں، اور کبھی کبھی تو موت تک

واقع ہو جاتی ہے۔ ایک دو واقعات ایسے ہو چکے ہیں جو خود میرے علم میں ہیں۔ آپ میری ان باتوں کو مبالغہ آرائی پر محمول نہ کیجیے۔ ایسے استادوں نے ہر اسکول کو ایک مقتل بنا رکھا ہے جہاں ہر بچے کی روح کو کچلا جاتا ہے، اور اس کی خداداد صلاحیتوں پر آرے چلائے جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس جابرانہ اور بہیمانہ ماحول میں جس بچے کی نشو و نما ہوگی وہ زندگی سے بیزار، تعلیم سے متنفر، ماحول سے برگشتہ اور معاشرے سے بے نیاز ہو جائے گا۔ اس کے اندر نفسیاتی طور پر ایک آتش فشاں پھٹنے کے لیے تیار ہوگا۔ اس سے کسی تعمیری رویے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آوارگی اس کا مزاج بن جاتی ہے۔ اور جب وہ اسکول کی مختلف منزلیں طے کرتا ہوا اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج اور یونیورسٹی تک پہنچتا ہے اور اسے آزادی کی کھلی فضا ملتی ہے تو اس کی کچلی ہوئی روح اس کو سر اٹھا کر چلنے کے لیے اکساتی ہے۔ گویا وہ غیر شعوری طور پر معاشرے اور ماحول سے اس اذیت کا انتقام لیتا ہے جو اس کو بچپن میں اٹھانی پڑتی ہے۔ اب اس کے پاس ایک چھری ہوتی ہے، ایک پستول ہوتا ہے، ایک سٹین گن ہوتی ہے، وہ اپنے پاس ایک پنجہ رکھتا ہے جس سے منہ نوچا جا سکتا ہے اور جسم کے مختلف حصوں پر کاری ضرب لگائی جا سکتی ہے اور وہ ان سب ہتھیاروں سے لیس ہو کر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتا کم اور ہنگامہ آرائی زیادہ کرتا ہے۔ نوبت قتل و غارت تک پہنچتی ہے۔ سیاسی لوگ اس کو اپنا آلہ کار بناتے ہیں، اور وہ اخلاقی اعتبار سے تعلیمی اداروں، اُستادوں اور خود معقول طالب علموں کے لیے ایک مصیبت بن جاتا ہے۔ وہ طالب علموں کو ستاتا ہے یعنی بعض استادوں کا آلہ کار بنتا ہے۔ بعض کی توہین کرتا ہے اور اس طرح سارے نظامِ تعلیم کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ سب طالب علم ایسے نہیں ہوتے کیونکہ بعضوں کی روح اس طرح کچل دی جاتی ہے کہ ان کے اندر ہتھیار رکھنے کی صلاحیت تو درکنار اپنے آپ کو صحیح طور پر زندہ رکھنے کی سکت تک باقی نہیں رہتی۔ ان کی روح مُردہ ہو جاتی ہے۔ زندگی کی خوبصورتی کا احساس

ان کے ہاں باقی نہیں رہتا۔ اور اس طرح وہ دنیا کے کام کے نہیں رہتے۔ ایسے طالب علم خوشامد، چاپلوسی اور سازشوں سے کام نکلتے ہیں اور جب نام نہاد تعلیم سے فارغ ہوکر باہر نکلتے اور زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو اس معاشرے کا صحیح فرد ثابت کرتے ہیں جس کا نقشہ میں نے شروع میں پیش کیا ہے۔ اور جس میں مادہ پرستی، منافقت، زندگی سے بیزاری، انسانی قدروں سے روگردانی اور اخلاقی معیاروں سے بے نیازی کے خیالات و تصورات عام ہوتے ہیں، اور ان کو شعوری یا غیر شعوری طور پر عملی صورت بھی دی جاتی ہے۔

کالج اور یونیورسٹی تک جو طالب علم پہنچنا چاہتے ہیں ان میں ایک قسم ایسے طالب علموں کی بھی ہے جن کو باقاعدہ طور پر تعلیمی اداروں میں داخل ہونا نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن وہ ذہنی طور پر طالب علم رہتے ہیں۔ پڑھنا چاہتے ہیں لیکن پڑھ نہیں سکتے۔ داخل ہونا چاہتے ہیں لیکن داخل نہیں ہوسکتے تعلیمی اداروں کی تنگ دامانی، ارباب اختیار کی سفاکی اور نام نہاد اساتذہ کی تن آسانی انہیں، نہ صرف سائنس اور ٹیکنالوجی، طب اور انجینئرنگ بلکہ زبان اور ادب کے مطالعے تک سے محروم رکھتی ہے۔ اس قسم کے طالب علم داخلوں میں ناکام ہونے کے بعد تعلیمی اداروں کے چکّر لگاتے ہیں۔ پہلے اور دوسرے قسم کے طالب علموں سے دوستی اور گٹھ جوڑ کرتے ہیں اور اکثر اس ہنگامے میں پیش پیش نظر آتے ہیں جن سے تعلیمی دنیا کو آئے دن دوچار ہونا پڑتا ہے، اور جو اب ہماری تعلیمی زندگی کا معمول بن گیا ہے۔ اساتذہ اور انتظامیہ کا ان پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ہر طرح آزاد ہوتے ہیں۔ اور اتنے بے باک اور نڈر کہ اساتذہ کو خاطر میں نہ لانا، بلکہ ان کی توہین کرنا جیسے ان کے لیے کوئی بات ہی نہیں۔ ایسے طالب علم بغیر کسی روک ٹوک کے تعلیمی درس گاہوں میں دندناتے پھرتے ہیں اور اساتذہ، انتظامیہ اور خود اچھے طالب علموں کے لیے ایک مسئلہ بنے رہتے ہیں۔

غرض غلط قسم کے حالات میں پرورش پانے کی وجہ سے طالب علموں کے بعض طبقوں میں ایک نراجی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ کیونکہ ان سب کا مزاج انتشار پسندانہ اور خیر و شر سے بے نیاز ہے۔ یعنی ان کا انداز پوری طرح نراجی (Anarchical) ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان

لوگوں کو پولیس کی گولیوں اور سنگینوں سے راہ راست پر لایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کا تشدد کیا بھی گیا ہے۔ لیکن اس کے نتائج ہمیشہ خراب نکلے ہیں۔ کیونکہ اس طرح تعلیمی ماحول میں ڈر اور خوف کی فضا عام ہو جاتی ہے اور علمی و تعلیمی ماحول ختم ہو جاتا ہے۔ اور طالب علم تشدد پسند ہو کر زیادہ بے راہ رو ہو جاتے ہیں۔ ان کے مزاجوں میں زیادہ شدت پیدا ہو جاتی ہے اور اساتذہ اور انتظامیہ پر سے اُن کا اعتماد بالکل ہی اٹھ جاتا ہے

اس مسئلے کا حل تعلیمی اداروں میں پولیس کا بلانا، اور ان سے طالب علموں کو پٹوانا نہیں ہے کچھ اور ہی ہے۔ اپنے قیام انگلستان کے دو واقعات مجھے ابھی تک یاد ہیں جن سے اس مسئلے پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

غالباً ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ یورپ کے مشہور طالب علم رہنما ڈینی دی ریڈ ...... نے فرانس میں بڑے پیمانے پر طالب علموں کے ہنگامے کرائے تھے۔ ڈینی (دی ریڈ) جرمن تھا لیکن وہ کسی طرح فرانس میں داخل ہو گیا۔ فرانس میں ہنگامے کروانے کے بعد وہ ایک رات کسی طرح لندن پہنچ گیا، اور صبح یہ بیان دیا کہ میں انگلستان کے طالب علموں کو غیرت دلانے کے لیے آیا ہوں۔ برطانوی پارلیمنٹ نے اسے تین دن لندن میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ تیسرے دن اس نے کہا کہ مجھے گرفتار کر لیا جائے میں لندن سے نہیں جاسکتا۔ معاملہ پھر پارلیمنٹ میں پیش ہوا۔ پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا کہ اس کو ایک مہینے کے لیے لندن میں ٹھہرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

یہ خبر سُن کر وہ چوتھے روز یورپ واپس چلا گیا۔ ان تین دنوں میں بی بی سی پر اس کے انٹرویو ہوئے۔ دنیا کے بیشتر باغی طالب علموں کو جمع کیا گیا اور ٹیلی ویژن پر ان طالب علموں کے مسائل پر ایک مذاکرہ ہوا۔

اس طرح بھڑاس نکل گئی اور انگلستان میں امن رہا۔

دوسرا واقعہ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی کا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں وہاں کے طالب علموں نے کلاسوں کے بائیکاٹ کا اعلان کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ جائے اور کافی

کی پیالی کی قیمت پانچ پنس کی بجائے صرف چار پنس ہونی چاہیئے، حالانکہ گرانی کی وجہ سے چار پنس میں چائے یا کافی نہیں مل سکتی۔ اسی خیال سے ایک پینی کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اسکول کے ڈائرکٹر پروفیسر سرسرل فلپس نے اساتذہ کی مخالفت کے باوجود طلباء کا مطالبہ تسلیم کر لیا اور کہا کہ ایک پینی کی کمی کسی اور فنڈ سے پوری کردی جائیگی۔ اس روّیے نے بائیکاٹ کو ایک دن میں موت کے گھاٹ اتار دیا اور حالات نارمل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طالب علم صرف شفقت اور محبت اور عفو و درگذر ہی سے قابو میں رہتا ہے۔ جرم و سزا کا کاروبار اس نظام میں کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ میرا یہ ذاتی تجربہ ہے۔ یہ حقیر فقیر تیس بتیس سال سے طالب علموں کو پڑھانا اور حتی الامکان ان کی شخصیت اور کردار کی تعمیر میں اپنا وقت گذارتا ہے اور آج میں بڑے فخر سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں نے شفقت اور محبت کے سحر سے اپنی معلمی کے زمانے میں بڑے بڑے جنوں کو شیشے میں اتارا ہے۔ اس شفقت اور محبّت کے سامنے ان کی چھُریاں ان کے پستول، اور ان کی سٹین گنیں بیکار ہوگئی ہیں —— مجھے کبھی پولیس کو نہیں بلانا پڑا۔ مجھے بعض اوقات اوپر سے ہدایات ملی ہیں کہ طالب علموں کا الیکشن ہو رہا ہے آپ کے ہاں پولیس کے دستے تعینات کئے جائیں گے۔ لیکن میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ مجھے ضرورت نہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور بزرگان دین کی مدد سے میرا کاروبار صحیح طور پر چلا ہے اور ہر کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام پایا ہے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ طالب علم صرف اچھے اور بلند اخلاق رکھنے والے اساتذہ کی شفقت اور محبت ہی سے قابو میں رہ سکتے ہیں۔ مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اس کے ان گنت تجربات ہوئے ہیں میرے بیشتر استاد طالب علموں کے لیے شفقت اور محبت کا مجسمہ نظر آتے تھے۔ ان کا کام ہماری یونیورسٹی میں ہر طالب علم کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آنا تھا۔ چنانچہ طالب علم ان کا اتنا احترام کرتے تھے کہ شاید ہی ایسا احترام کسی اور کو نصیب ہوا ہو۔ طالب علم ان کے اس قدر گرویدہ تھے کہ ان کی ہر بات ماننے کو تیار ہو جاتے تھے۔ صرف اشارے کی دیر تھی مجھ پر تو ان کی ہمیشہ ان کی خاص شفقت رہی ہے۔

آج کے نوجوان اور خصوصاً طالب علموں میں اخلاقی گراوٹ کے جو آثار نظر آتے ہیں، اس کی ذمہ داری ہم پر ہے اور ہم سے مراد ہے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی انتظامیہ اور اساتذہ۔ ہم نے شفقت، اور محبت کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ ہم سب سفاک ہو گئے ہیں۔ ہم اپنے نوجوانوں کو اپنے بچوں کی طرح نہیں سمجھتے۔ ہم ان کے مسائل کا شعور نہیں رکھتے اور شعور رکھتے بھی ہیں تو انہیں سمجھنا اور سمجھ کر سلجھانا نہیں چاہتے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ نوجوانوں اور طالب علموں کی یہ نسل کس آشوبِ قیامت سے دوچار ہے اور یہ کہ ان کے دل و دماغ کن طوفانوں اور بھونچالوں کی آماجگاہ ہیں۔

(۵)

ہمارا عام اور اوسط درجے کا طالب علم غربت اور افلاس کے سائے میں آنکھ کھولتا ہے۔ اس کی نشو و نما ایک غیر متوازن ماحول میں ہوتی ہے۔ اس کو اچھے اور معیاری اسکولوں میں داخلہ نہیں ملتا۔ اس کام کے لیے اسے خاصی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ جن اسکولوں میں عام طالب علموں کو داخلہ ملتا ہے وہاں کا ماحول معیاری نہیں ہوتا۔ اساتذہ طالب علموں سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ اس طالب علم کا رجحانِ طبع کس شعبے کی طرف ہے۔ وہ ایسے مضامین بھی زبردستی پڑھتا ہے جن سے ان کی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کی تشکیل نہیں کر پاتا۔ وہ مار بھی کھاتا ہے، سفاکی کا شکار بھی ہوتا ہے اور یہ صورت حال اس کو تعلیم اور علم سے برگشتہ اور متنفر کر دیتی ہے۔

اس میں سے بیشتر طالب علم تو راستے ہی میں تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں، اور تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ حالیہ اعداد و شمار یہ ہیں کہ صرف دو فی صد طالب علم انٹرمیڈیٹ تک پہنچتے ہیں، اور یونیورسٹی تک پہنچتے پہنچتے تو ان کی تعداد اس سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ ہر مرحلے پر انہیں داخلے کی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس کو ہم اعلیٰ تعلیم کہتے ہیں وہ ہمارے نوجوانوں کے لیے شجرِ ممنوعہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جس وقت سمسٹر سسٹم کا نظام قائم ہوا اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے

مختلف شعبوں میں مجموعی طور پہ کل تعداد چھ سات سو سے زیادہ نہیں تھی، اور اورینٹل کالج کے تمام شعبوں میں تو اس وقت کل تعداد زیادہ سے زیادہ تیس بتیس رہ گئی تھی۔ پہلے یونیورسٹی میں چھ سات ہزار تعداد ہوتی تھی، اور اورینٹل کالج میں چھ سات سو طالب علم ہوتے تھے۔ لیکن اب نئے قوانین ایسے بن گئے ہیں کہ تعداد بڑھ نہیں سکتی۔ گزشتہ سال بی۔ اے کا نتیجہ آنے کے دس مہینے بعد داخلے ہوئے اور مٹھی بھر طالب علموں کو داخل کیا گیا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہزاروں کی تعداد میں جو طالب علم داخلہ لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے پڑھنا چاہتے تھے۔ وہ اب بیکار اور آوارہ پھر رہے ہوں گے اور لڑکیاں گھروں میں خود اپنے لیے اور اپنے والدین کے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہوں گی۔ ان حالات میں اخلاق کو بلند رکھنا اور ان کے اخلاقی مسائل کو سلجھانا، ہوا میں باتیں کرنے کے مترادف ہو گا۔ شکوہ کیجیے اور توجہ دلایئے تو جواب ملتا ہے کہ صاحب سمسٹر شروع ہو چکا ہے، تعداد کم ہونی چاہیئے حالانکہ جہاں سے سمسٹر کے نظام کا تصوّر لیا گیا ہے وہاں کی یونیورسٹیوں میں طالب علموں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے، مینی سوٹا، ہارورڈ اور کولمبیا، پرنسٹن، شکاگو کی یونیورسٹیوں میں سے ہر ایک میں پچاس پچاس ہزار ساٹھ ساٹھ ہزار سے اوپر تعداد ہو گی اور نیویارک کیلی فورنیا اور اسی قسم کی دوسری یونیورسٹیوں میں تو طلباء کی تعداد لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کبھی کم نہیں ہوتی۔ حالانکہ سمسٹر کا نظام وہاں بھی قائم ہے۔

میں اعلیٰ تعلیم میں پابندیوں کا قائل نہیں ہوں۔ خصوصاً ایسے ملک میں جہاں پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد پندرہ بیس فی صد اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد تو دو تین فی صد سے زیادہ نہیں ہو گی۔

میں نے اپنی تدریسی زندگی میں طلبار کے داخلوں پہ پابندی نہیں لگائی ہے۔ بلکہ ہمیشہ اس معاملے میں نرمی برتی ہے۔ اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی ہے کہ جو لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، انہیں اس کا موقع ملنا چاہیئے۔ کیونکہ اس طرح بہت سے طالب علموں کی زندگیاں بنتی ہیں، اور انہیں ترقی کے رستے پہ آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔

ایک واقعے کو تو میں کبھی بھی بھلا نہیں سکتا۔

کئی سال اُدھر کی بات ہے۔ ایک بزرگ اپنی بیٹی کو لے کر میرے پاس آئے اور کہا کہ "اس نے بی اے میں فارسی پڑھی ہے۔ ڈویژن بھی تھرڈ ہے لیکن آپ اس کو ایم اے اُردو میں داخل کر لیجیے۔

میں نے ان سے کہا "لڑکی نے فارسی پڑھی ہے اس لیے ایم اے فارسی میں اس کو داخل کرنا مناسب ہوگا۔ میں صدر شعبۂ فارسی سے سفارش کر دیتا ہوں"۔

یہ سُننا تھا کہ بڑے میاں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک طوفان اُمڈا، اور یہ آنسو اُن کی سفید داڑھی پر پھیل گئے۔

میں نے اُن سے رونے کی وجہ دریافت کی۔

کہنے لگے" میں تو بڑی امیدوں کے ساتھ آپ کے پاس آیا تھا۔ سنا تھا آپ شفیق استاد اور رحم دل آدمی ہیں اور طالب علموں کو آسانی سے داخل کر لیتے ہیں۔ دوسرے شعبوں میں سختی برتی جاتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت بڑی غلطی کی ہے، وہ یہ کہ جب اس لڑکی کی ماں کا انتقال ہوا تو میں نے دوسری شادی کر لی۔ اب اس لڑکی کی سوتیلی ماں نے زندگی کو اس کے لیے مصیبت بنا دیا ہے۔ دن بھر گھر کا کام کرواتی ہے اور بُرا بھلا کہتی ہے، داخلہ ہو جائے گا تو یہ گھر سے دور رہے گی اور مصیبت اور پریشانی سے بچ جائے گی۔

یہ روداد سُن کر میرا دل بھر آیا۔ میں نے اس لڑکی کو ایم اے اُردو میں داخل کر لیا۔

اس لڑکی نے دو سال میں ایم اے کیا۔ پھر بی۔ ایڈ پاس کیا۔ اپنے وطن ہی میں لڑکیوں کے اسکول میں اس کو ملازمت مل گئی۔ شادی بھی ہو گئی۔ اور اب وہ بہت خوش ہے۔ ایک شخص کی ذرا سی ہمدردی سے ایک زندگی بن گئی۔ اور ایک خاندان کا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔

میں ایک استاد کی حیثیت سے پانچ سال تک لندن یونیورسٹی میں کام کرتا رہا ہوں۔ وہاں بیشتر یونیورسٹیوں میں داخلوں پر پابندیاں ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ مشکل سے داخلہ ملتا ہے۔ لیکن وہاں جس طالب علم کو داخلہ نہ ملے یا جو داخلہ نہ لینا چاہے۔ اس کو پندرہ سال کی

عمر کے بعد کہیں نہ کہیں ملازمت مل جاتی ہے۔ اس پر خاندان کا [illegible] ہوتا۔ لیکن ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک میں تعلیم کو محدود کرنا، اس پر پابندی لگانا جہاں کالج اور یونیورسٹی کے دروازے پر دستک دینے والوں کی شرح دو چار فی صد سے زیادہ نہیں ہے کسی طرح بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین میں آپ اپنے محدود وسائل کے پیش نظر تعلیم کو کسی حد تک محدود کر سکتے ہیں لیکن انسانی علوم، خصوصاً زبان اور ادب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے تعلیمی اداروں کے دروازوں کو طالب علموں کے لیے بند کر دینا کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا، اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ ایسا کر رہے ہیں وہ علم، تہذیب اور اخلاق کے دشمن ہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے طالب علم، طالب علم نہیں رہیں گے، وہ بیکار پھریں گے اور خاندان اور معاشرے کے لیے سنگین اخلاقی مسائل کو پیدا کریں گے۔ کیونکہ اخلاق کا صحیح تصور اور اس کو عملی شکل دینے کا خیال بھی صحیح تعلیم ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ کوئی اور طاقت اخلاقی مسائل کو سلجھانے کا کام انجام نہیں دے سکتی۔

تعلیم اور خصوصاً اعلیٰ تعلیم سے محرومی ہمارے نوجوانوں کو بیکار کر دے گی وہ سڑکوں اور بازاروں میں نکل کر افراد اور معاشرے کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔ بیکار آدمی بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ وہ ہر ہنگامے میں خواہ مخواہ شریک ہونے کے لیے تیار رہتا ہے بلکہ اس کا انتظار کرتا ہے۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

جب ایوب خان کے خلاف طالب علم ہنگامے کر رہے تھے تو طالب علموں کے ایک بہت بڑے جلوس کے ساتھ ایک بوڑھا شخص بھی شریک تھا جو زور زور سے نعرے لگا رہا تھا اور بہت شور مچا رہا تھا۔

ایک طالب علم نے اس سے پوچھا " بابا جی تسی کیتھے جا رہے ہو؟ اے طالب علماں دا جلوس ہے (بابا جی تم کہاں جا رہے ہو۔ یہ تو طالب علموں کا جلوس ہے)

اس نے جواب دیا :" میں بیکار آں مینوں کوئی کام نہیں (میں بیکار ہوں مجھے کوئی اور کام نہیں)"

توجناب بیکار آدمی کی نفسیات یہ ہوتی ہے۔ وہ بے مقصد اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے اور بغیر سوچے سمجھے ہر ہنگامے میں شریک ہو جاتا ہے۔ اخلاق کی توقع اس سے نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے اگر نوجوانوں اور طالب علموں کے اخلاق کو درست کرنا ہے اور ان کے اخلاقی مسائل کو سلجھانا ہے تو انہیں تعلیم اور صحیح تعلیم کی طرف متوجہ کیجئے اور علم حاصل کرنے دیجئے۔ کیونکہ وہ تو اس جماعت اور معاشرے کے افراد ہیں جن کو ہدایت یہ دی گئی ہے کہ علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ اور علم حاصل کرنے کے لیے شفیق اساتذہ کی ضرورت ہے۔ ایسے اساتذہ کو تیار کیجئے جو صحیح معنوں میں علم کی روشنی پھیلا سکیں، جو تعلیم کو صرف کتاب پڑھنے اور پڑھانے تک محدود نہ سمجھیں، بلکہ طلبار کی تربیت اور ان کی شخصیت کی تعمیر کو اپنا فرض جانیں۔ کہ صرف یہی صورت حال، نظام تعلیم، اساتذہ اور طلبار کے مسائل کو سلجھا سکتی ہے، اور انہیں معاشرے کے اچھے پاکیزہ مہذب اور باشعور بنا سکتی ہے۔

آج ہمیں اس کیفیت کی جتنی ضرورت ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ کیونکہ یہ وقت ماحول اور معاشرے کا تقاضا ہے۔ اس اہم کام کو انجام دینے کے لیے بقول علامہ اقبالؒ پیر مردوں میں فراست اور نوجوانوں میں محبّت کے چراغوں کا فروزاں ہونا ضروری ہے۔ آج سے برسوں قبل کسی اور موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں ہمالہ، اٹک اور اوڈگنگ کو مخاطب کر کے یہ شکوہ کیا تھا کہ ہمارے پیر مرد فراست سے اور ہمارے نوجوان محبت سے بے نصیب ہیں اور یہ افسوسناک صورتحال ایک انقلاب ہی سے سدھر سکتی ہے۔

اے ہمالہ، اے اٹک اے اوڈگنگ — زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب — نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر — خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر

کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب، اے انقلاب، اے انقلاب

ہمارا نظام تعلیم آج بزرگوں میں اسی فراست اور نوجوانوں میں اس [illegible] ی ہے اور اس کے ہاتھوں پیدا ہونے
والے انقلاب کے لیے چشم براہ ہے۔

اُردو — پاکستان کی قومی زبان

اُردو زبان کے جدید رجحانات

اُردو پر مغرب کے اثرات

اُردو زبان کی موجودہ صورتِ حال

اُردو ـــــ پاکستان کی قومی زبان

اُردو زبان دنیا کی چند اہم زبانوں میں سے ہے۔ اقوام متحدہ نے اس کو گنتی کی چند اہم زبانوں میں شمار کیا ہے۔ اس اہم بین الاقوامی ادارے کے فیصلے کے مطابق یہ زبان تیسرے چوتھے نمبر پہ ہے۔ انگریزی، چینی اور روسی کے بعد اس کا نمبر آتا ہے۔ یہ برعظیم ہندوپاکستان کے کروڑوں مسلمانوں کی مادری زبان ہے، اور جن کروڑوں انسانوں کی یہ مادری زبان نہیں ہے، وہ اس کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں اور اس کو اس طرح بولتے ہیں اور اس سے اس طرح کاروبارِ حیات کو چلاتے ہیں جیسے یہ ان کی مادری زبان ہے۔ کروڑوں انسان ایسے ہیں جو اس کی ادبی اور تہذیبی و ثقافتی اہمیت کے قائل ہیں اور تہذیب و ثقافت کی علامت سمجھ کر اس زبان کو اپنے دلوں میں جگہ دیتے ہیں۔ یہ برعظیم ہندوپاکستان سے باہر بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ زبان کئی زبانوں کے امتزاج سے بنی ہے، اور کئی تہذیبوں کا سنگم اس میں نظر آتا ہے۔ اس لیے ماہرینِ لسانیات اس زبان سے گہری دلچسپی لیتے ہیں، اور مغربی ممالک میں اس زبان کے لسانی پہلوؤں پر ماضی میں بھی قابلِ قدر کام ہوا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ اس زبان کا ادب دنیا کی ادبی روایت میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے، شاعری، ناول، افسانہ اور تنقید و تحقیق کے میدانوں میں جو ادبی کارنامے اس زبان نے انجام دیئے ہیں وہ انسانیت کی ادبی تاریخ میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ یہ ہندو مسلم تہذیب کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔ اس میں علاقائی تہذیبوں کا

عکس بھی ملتا ہے۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ اسلام اور مس[illegible]
ہے۔ اسی چھاپ نے اس کو مسلمانوں کی زبان بنا دیا [illegible] رنگ و آہنگ اس
زبان میں کسی کی شعوری کوشش سے پیدا نہیں ہوا [illegible] کی جڑیں اس برعظیم کی تاریخ میں
دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مسلمان اس برعظیم میں فاتح کی حیثیت سے آئے، اور انہوں
نے اس سرزمین پر ہزار ڈیڑھ ہزار سال تک حکومت کی۔ وہ سب کے سب مسلمان تھے۔ اور
اسلام کا درد ان میں سے ہر ایک کے دل میں موجود تھا۔ ان کے بادشاہ بقول اقبالؒ خیرالامم
کے تاجدار تھے جو آج بھی اس برعظیم کی خاک میں محو خواب ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مسلمانوں نے
اس زبان میں اسلام کا رنگ و آہنگ پیدا کیا۔ چنانچہ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ غیر مسلم
تک جب اس زبان میں کوئی کتاب لکھتے تھے تو اس کا آغاز خدا اور رسولؐ کے پاک نام سے
کرتے تھے۔ حمد و نعت کے بغیر اس زبان میں کسی ادبی کام کو شروع نہیں کیا جا سکتا تھا۔
پھر جو دینی ادب اس زبان میں پیدا ہوا ہے اور اسلامی فکر کے مختلف پہلوؤں پر جو عظیم کارنامے
اس میں انجام دیئے گئے ہیں وہ فکر اسلامی کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھے جاتے
رہیں گے۔ اور ہمارے صوفیائے کرام نے انسانیت اور انسان دوستی کو بنیاد بنا کر جو کام
اس زبان میں کیا ہے، وہ اپنی انسانی اہمیت کی وجہ سے ہماری تاریخ و تہذیب کی پیشانی
پر ہمیشہ ہمیشہ جھومر بن کر جگ مگ جگ مگ کرتا رہے گا۔

(۲)

ان خصوصیات سے مالا مال ہماری یہ اردو زبان ہمارے اس وطن عزیز اسلامی جمہوریہ
پاکستان کی قومی زبان ہے۔ اس لیے کہ یہ اسلامی رنگ و آہنگ کی حامل ہے۔ اس لیے کہ
یہ برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ، تہذیب و ثقافت کی علم بردار ہے۔ اس لیے کہ یہ اس
سرزمین کے کروڑوں انسانوں کی مادری زبان ہے، اور جن کی مادری زبان نہیں ہے وہ
اس کو اپنی مادری زبان سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ قومی وحدت
کی علامت ہے۔ اس لیے کہ وہ ملت اسلامیہ کی یک جہتی کی نشانی ہے۔ اس لیے کہ اس کی

...ت کا لہو ہے۔ اس لیے کہ وہ اس فکر و خیال کی امین ہے جس پر اس وطنِ عزیز ... ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے ... پاکستان کی تحریک اور دو قومی نظریے کی تشکیل میں اس زبان نے بڑا اہم کام کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ قیامِ پاکستان کی تحریک میں جن بنیادی باتوں کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا ان میں ایک اردو زبان کے تحفظ اور بقار کا مسئلہ بھی تھا۔ برعظیم کی تاریخ شاہد ہے کہ برادرانِ وطن کی تنگ نظری اور ماضی پرستی نے زبان کے مسئلہ کو سیاسی مسئلہ بنا دیا۔ اور اپنے رجعت پسندانہ اقوال و افعال سے تقریباً سوا ڈیڑھ سو سال تک اس کو روز بروز زیادہ سے زیادہ الجھاتے رہے۔ تنگ نظری معقولیت کا خون کس طرح کرتی ہے، اس کا اندازہ رجعت پسندانہ ہندو ذہنیت کے اس رویے سے ہو سکتا ہے جو اس نے زبان کے معاملے میں اختیار کیا۔ ماضی سے دلچسپی لینا اور اس کو سینے سے لگانا ایسی کوئی بُری بات نہیں۔ لیکن اگر اس رویے سے آنکھوں پر پٹی باندھ لی جائے اور تہذیب و ثقافت کے ان دھاروں کا احساس ہی باقی نہ رہے جو تاریخ کے منبع سے پھوٹتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ انسان اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے گا۔ اور وہ راستے اسے نظر نہیں آئیں گے جو ترقی، اور ارتقار کی طرف لے جاتے ہیں۔

ہندوؤں کی تاریخ کا تقریباً گذشتہ دو ڈھائی صدی کا زمانہ ایسا ہے جس میں وہ اسی صورتِ حال سے دوچار رہے ہیں۔ پراچین بھارت کو ایک دفعہ پھر زندہ کرنے کی خواہش ان کے دلوں میں مچلتی رہی ہے۔ پیچھے کی طرف لوٹ جانے کی آرزو ان کے ذہنوں میں انگڑائیاں لیتی رہی ہے۔ ہندو ذہنیت تھی تو ہمیشہ سے ایسی لیکن مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں کچھ دبی دبی سی رہی۔ مسلمانوں کو ملیچھ سمجھ کر ان سے علیحدگی اختیار کرنا ہندوؤں کے ایک بہت بڑے طبقے کے لیے دھرم ایمان کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار برعظیم کی تاریخ میں برابر ہوتا رہا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب مسلمان انگریزوں کے مقابلے میں سپر انداز ہو گئے، تو اس ہندو ذہنیت نے ایسے ایسے گل کھلائے کہ عقل

اس پر آج بھی انگشت بدنداں ہے۔ اس میں شک [illegible] پسند ہندوؤں نے اس رجعت پسندی کی مخالفت [illegible] کا یہ طوفان اتنا تیز اور تند تھا کہ ترقی پسندی اس میں خس و خاشاک کی طرح [illegible]

اس صورت حال نے زبان کے مسئلے کو بے حد پیچیدہ بنا دیا۔ آریہ سماج، شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ سنسکرت آمیز شدہ ہندی کو عام کرنے کی کوشش کی گئی جس کا مقصد اُردو کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنا تھا۔ کیوں کہ اس زبان پر اسلام کی چھاپ گہری تھی اور وہ ایک ایسی زبان تھی جو ترقی کرنے میں پیش پیش تھی۔ ہندو مسلمان سب اس کے دلدادہ تھے۔ لیکن رجعت پسندوں کو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ترقی کو روکنے اور ایک مصنوعی زبان کو عام کرنے کے لیے مذہبی عصبیت کو ہوا دی گئی اور اس کام کے لیے ہندو خزانوں کے منہ کھول دیئے گئے۔ چنانچہ بیسویں صدی کی آنکھوں نے اس سلسلہ میں عجیب عجیب باتوں کو دیکھا۔ سیاست تک اس سے متاثر ہوئی اور مسلمانوں نے بھی علیحدگی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ان کی آنکھوں نے یہ دیکھا کہ سر تیج بہادر سپرو، پنڈت سندر لال اور پنڈت برجموہن، دتاتریہ کیفی اور پنڈت آنند نرائن مُلّا کی کوششیں بھی تمام تر ناکام ہوتی جا رہی ہیں۔

سب سے پہلے انیسویں صدی میں سرسیّد احمد خان نے اس رجعت پسندانہ ہندو ذہنیت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اس داستان کو اُردو کے سب سے بڑے مجاہد بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کی زبانی سنیئے۔

" اس برعظیم کے مسلمانوں کی تمام تحریکیں یعنی علمی، ادبی، سیاسی کا سرچشمہ سرسیّد احمد خاں کی ذات تھی۔ یوں تو مسلمانوں کا انحطاط و زوال بہت پہلے سے شروع ہو گیا تھا۔ مگر اس کا احساس عام طور پر نہیں ہوا تھا۔ لیکن گذشتہ صدی کے نصف کے چند سال بعد جب ہندوستان کی حکومت میں انقلاب پیدا ہوا تو مسلمان ہی سب سے زیادہ کچلے گئے۔ ایک طرف آقایانِ ملک کی نظر میں معتوب، مردود اور باغی ٹھہرے، اور دوسری طرف برادرانِ وطن نے نئی نئی

[illegible] آقاؤں کی شہ پاکر انہیں ذلیل و برباد کرنا شروع کیا۔ فاتح کے ہاتھوں مفتوح پر [illegible] ہوتا جتنا قوت پانے کے بعد مفتوح کے ہاتھوں فاتح پر ہوتا ہے۔ یہی حال مسلمانوں کا ہندوستان میں ہوا۔ وہ دونوں طرف سے راندہ تھے اور چکی کے دو پاٹوں میں پسے اور دبے جا رہے تھے۔ اس سے دل بجھ گئے تھے اور مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ دو بڑی قوتوں کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہ تھی، اور وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسے میں مولوی سیّد احمد خان نے غیر معمولی دور اندیشی اور ہمّت سے کام لے کر وہ کام کیا جو کسی اور سے نہ ہو سکا اور جس کی کسی کو توقع نہ تھی۔ اور تمام مخالفتوں، مزاحمتوں اور مشکلات کو سر کرکے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا، اسے تکمیل تک پہنچا کے رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے نازک وقتوں میں جب قومیں قعرِ مذلّت تک پہنچ جاتی ہیں تو انہیں میں سے ایسے باہمت نوجوان اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بچا لیتے ہیں اور تاریخ میں ایک نیا عہد قائم کرتے ہیں۔ سر سیّد بھی انہیں برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے۔ ان کے بعد بھی جتنی اصلاحات، تعمیرات اور منصوبے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے عمل میں آئے، جب ہم ان کی ابتدار کا سراغ ڈھونڈتے ہیں، تو اسے سر سیّد احمد خاں کی مساعی میں پاتے ہیں۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۴۹۹)

یہ سر سیّد ہی تھے جنہوں نے اس برِعظیم کے مسلمانوں کی زبوں حالی کو محسوس کیا، اور زبان کے مسئلے کو اہمیت دی۔ کیونکہ یہ مسئلہ مسلمانوں کی تہذیب کا بنیادی مسئلہ تھا۔ انہوں نے اردو کی حمایت کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو مسلمانوں کی تہذیب کی بنیاد ہے۔ اور اگر اس زبان پر آنچ آئی تو مسلمان اس کو کسی حال میں بھی برداشت نہیں کریں گے۔ وہ جان کی بازی لگا دیں گے اور ہندوؤں کے ساتھ ان کا کوئی رابطہ باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ وہ ایک علیحدہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے آج سے تقریباً سو سال قبل واضح طور پر علی گڑھ کی تعلیمی سروے کی رپورٹ میں لکھا!

" تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا ،

خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، خیال پیدا ہوا ہے، اور ہمیشہ میری [illegible] مل کر دونوں کی فلاح کی کوشش کریں۔ مگر جب سے ہندو صاحبان [illegible] خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان اور فارسی کو، جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹا دیا جائے، اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔ میں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اس سے ہوئی۔"

اس طرح دو قومی نظریے کا تصور سب سے پہلے سر سیّد احمد خان نے پیش کیا، اور اس کا آغاز زبان کے مسئلے سے ہوا۔ اُردو زبان کے بارے میں ہندوؤں کا رویّہ معاندانہ نہ ہوتا تو شاید سر سیّد اتنی شدّت سے اس کا اظہار نہ کرتے۔ اس طرح دیکھا جائے تو دو قومی نظریے کو پیش کرنے میں سر سیّد کی شخصیت کو اولیّت کا شرف حاصل ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی بنیاد اُردو زبان ہے۔ لیکن اس حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے تاریخی اور تہذیبی شعور کی ضرورت ہے جو آجکل ہمارے ہاں عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ سر سیّد کی اہمیت کو پہچاننا اور ہماری تاریخ میں جو کارنامہ انھوں نے تہذیبی اور لسانی اعتبار سے انجام دیا ہے، اس کا اندازہ لگانا ہر پاکستانی کے لیے ضروری ہے۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم لکھتے ہیں:۔

" اُردو نے ہر قومی تحریک اور خاص کر پاکستان کے بنانے میں بڑی مدد کی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی ابتدا ہی اُردو تحریک سے شروع ہوئی ہے۔ یہ آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں کہ تقسیم ملک کی بنیاد اس نظریے پر تھی کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔ یہ نظریہ، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، کسی سیاسی اختلاف کی بنا پر نہیں ہوا بلکہ یہ اس وقت وقوع میں آیا جب ہندوؤں کی طرف سے اُردو کی مخالفت شروع ہوئی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب انڈین نیشنل کانگرس کا وجود بھی نہ تھا۔ یعنی کانگرس کے قیام سے ۱۶ سال قبل ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں

نے [illegible] اداروں سے اُردو کے خارج کرنے کی مہم شروع کی۔ سر سیدؒ نے اس کا بڑی دلیری سے مقابلہ کیا۔ اس سے قبل وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ اور اس وقت تک انہوں نے جتنے کام کئے تھے۔ وہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کے تھے، جن میں ہندو مسلمان کی مطلق کوئی تفریق نہ تھی۔ سر سیدؒ فرماتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ اُردو کے مسئلے نے دو قومی نظریے کی ابتدا کی جو آگے چل کر قیام پاکستان کی تحریک کی بنیاد بنا۔ جس زمانے میں قیام پاکستان کی تحریک چل رہی تھی اس زمانے میں تو اس مسئلے نے بڑی ہی پیچیدہ صورت اختیار کر لی۔ شری پرشوتم داس ٹنڈن اور شری سمپورنانند، جیسے ہندی کے متعصب حامی تو درکنار، اس نے تو گاندھی جی تک کو بے نقاب کر دیا اور وہ یہ بات کہنے کے لیے مجبور ہو گئے کہ مسلمان چاہیں تو اُردو رکھ سکتے ہیں۔ یہ ان کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے اور اس کو مسلمان بادشاہوں نے پھیلایا ہے اور اب مسلمان ہی اس کو بولتے اور اس سے اپنا کام چلاتے ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے اس صورت حال کی تصویر نہایت ڈرامائی انداز میں کھینچی ہے۔ انجمن ترقی اُردو کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس ضمن میں اس واقعے کا ذکر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں جس نے انجمن کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کی مختصر روداد یہ ہے۔ ۱۹۳۵ء میں مسٹر کنہیا لال منشی (جو اب بیے غذا کے غذائی وزیر ہیں) مجھ سے حیدر آباد آ کر ملے اور بیان کیا کہ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ہمیں ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقفیت ہو سکے۔ آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہو جائیے۔ چونکہ یہ ادبی معاملہ تھا میں نے منظور کر لیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا سالانہ جلسہ ناگپور میں گاندھی جی کی صدارت میں ہوا۔ اس انجمن کا نام "اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد" تھا اس میں ایک مسئلہ یہ

پیش ہوا کہ پریشد کی زبان کیا ہونی چاہیئے۔ مجھ سے پوچھا تو میں [illegible] ہندوستانی [illegible] گاندھی جی نے دریافت کیا کہ میں ہندوستانی کیوں تجویز کرتا ہوں، میں نے کہا [illegible] لیے کہ انڈین نیشنل کانگرس کا یہ ریزولیوشن ہے کہ کانگرس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ نیز کانگرس کے آئین کی دفعہ ۲۱ میں صاف طور سے یہ درج ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ اس کا یہ مطلب نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا رہا تو کام کیسے چلے گا۔ گاندھی جی ہندی کے حق میں تھے۔ جب بحث زیادہ بڑھی تو گاندھی جی نے پینترا بدلا اور ایک نئی زبان اور ایک نیا نام تجویز کیا یعنی ہندی ہندوستانی۔ میں نے پوچھا، ہندی سے آپ کی کیا مُراد ہے؟ فرمایا وہ زبان جو کتابوں میں ہے۔ بول چال میں نہیں۔ پھر میں نے پوچھا ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ تو فرمایا جو بول چال میں ہے کتابوں میں نہیں۔ اس پر میں نے دریافت کیا تو پھر ہندی ہندوستانی زبان کیا ہوئی؟ - فرمایا وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟۔ اس پر انہوں نے جھنجھلا کر کہا کہ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے عرض کیا جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اُردو کیوں چھوڑ دیں! اس پر انہوں نے ایسا غلط اور عجیب و غریب جواب دیا جس کی ان سے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ فرمایا کہ مسلمان چاہیں تو اُردو رکھ سکتے ہیں۔ یہ ان کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندی اُردو کے مسئلے نے کیا صورت اختیار کر لی تھی۔ خاصا تلخ ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ پاکستان کی تحریک زور پر تھی۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب نے یہ محاذ سنبھال لیا تھا، قائدِ اعظم کی پشت پناہی انہیں حاصل تھی۔ سیاسی سطح پر مسلمانوں کے لیے جو جنگ قائدِ اعظم کی قیادت میں مسلم لیگ لڑ رہی تھی، وہ لسانی اور تہذیبی سطح پر انجمن ترقی اردو اور بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق لڑ رہے تھے۔ اس کی تفصیل انجمن کے رسالے "اُردو" اور اخبار ہماری زبان کی پرانی فائلوں میں محفوظ ہے۔

اس [illegible] کا ذکر ذرا تفصیل سے اس لیے کیا ہے کہ وہ تاریخی اور تہذیبی پس منظر ایک وقت ہمارے سامنے آسکے جو تحریک پاکستان میں بہت نمایاں تھا اور جس نے ہماری قومی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے اور ہماری قوم کو تعمیر وطن کے ایک نئے راستے پر گامزن کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

یہ جھگڑا اپنے شباب پر تھا جب ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے شہر لاہور میں قیام پاکستان کی قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی، اور اس کے بعد قیام پاکستان کی جدوجہد روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

اُردو کی تحریک کا اس میں خاصا ہاتھ تھا۔

(۳)

قائد اعظم اس زمانے میں برعظیم کے مسلمانوں کے متفقہ لیڈر تھے۔ ان کی عظیم قیادت پر مسلمانوں کو مکمل اعتماد تھا، اور وہ مسلمانوں کے اس قافلے کو منزل سے ہمکنار کرنے کے لیے ان تھک جدوجہد کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں اسی کام کے لیے وقف کر دی تھیں۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ میں اتنی مقبولیت کسی اور رہنما کو حاصل نہ ہو سکی جیسی کہ قائد اعظم کو حاصل ہوئی۔ قائد اعظم کی سیاسی بصیرت مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ایک قوم کی تشکیل کر رہے تھے۔ انہیں اس کے لیے ایک وطن بنانا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ایک قوم کو قوم بنانے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ قوم کے لیے سب سے بڑی ضرورت ایک ایسی زبان کی ہے جس کو قومی زبان کہا جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے لیے تعمیری کام کیا۔ اُردو کی تحریک کو ان کی پوری حمایت حاصل تھی، اور وہ ان کے سیاسی پروگرام کا ایک اہم حصہ تھی۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ ان کا رابطہ بہت گہرا تھا۔ اور جو کچھ مولوی صاحب لسانی محاذ پر کر رہے تھے، قائد اعظم کو اس سے پوری طرح اتفاق تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پاکستانی قوم کی تعمیر و تشکیل کا کام اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا جب تک اس کے پاس قومی زبان موجود

نہ ہے، اور یہ زبان ان کے خیال میں صرف اُردو زبان تھی۔

یہی سبب ہے کہ قائدِ اعظم نے تحریک پاکستان کے زمانے میں خود اردو سیکھی۔ ان کی مادری زبان اُردو نہیں تھی۔ وہ انگریزی پر پوری قدرت رکھتے تھے اور ان کا کام بڑی آسانی سے اس زبان میں چل سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے باقاعدگی کے ساتھ اُردو سیکھی۔ ۱۹۴۶ء تک انہیں اُردو بولنے کی ایسی مشق ہوگئی تھی کہ وہ اعتماد کے ساتھ اس زبان میں عوام کے سامنے تقریر کر سکتے تھے۔ میں نے خود اس زمانے میں اُردو بازار جامع مسجد دہلی کے ایک جلسہ عام میں ان کی تقریر اُردو میں سُنی ہے، جب کیبنٹ مشن آیا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے تقریباً پینتالیس منٹ تک پوری تقریر اُردو میں کی تھی۔ اور اس تقریر میں ان کی خطابت کا وہی انداز تھا جس کے لیے ان کی انگریزی تقریریں مشہور ہیں۔

قائدِ اعظم کی اُردو زبان سے اس دلچسپی ہی کا نتیجہ تھا کہ قیامِ پاکستان کی تحریک کے زمانے میں مسلمانوں کے ہر گھر میں اُردو کا چرچا تھا۔ برِ عظیم کے ہر علاقے کے مسلمان اس کو اپنی زبان سمجھتے تھے اور اس کی ترویج و اشاعت میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ ــــــــ

جگہ جگہ اُردو کانفرنسیں منعقد ہوتی تھیں جن میں اُردو کو پھیلانے اور عام کرنے کے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ جن علاقوں میں اُردو پر ستم ڈھائے جا رہے تھے وہاں اُردو تحریک کا اثر سب سے زیادہ تھا۔ سی پی کے صوبے کو اس اعتبار سے منفرد حیثیت حاصل تھی، اور شاید یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کی سات آٹھ فی صد آبادی کے اس صوبے کے دارالحکومت کو مولوی عبدالحق صاحب ناگ پور کی بجائے جاگ پور کہا کرتے تھے۔ پنجاب، سندھ اور سرحد کے صوبوں کا یہ حال تھا کہ مردم شماری کے موقع پر مسلمانوں نے اپنی مادری زبان، پنجابی، سندھی اور پشتو کی بجائے اُردو لکھوائی تھی۔

اور علامہ اقبالؒ نے تو اُردو تحریک کے بارے میں مولوی عبدالحق صاحب کو کئی خط لکھے تھے اور ان میں اس قسم کے خیالات کا اظہار تھا۔

"اس اہم معاملے (یعنی اُردو تحریک) میں مَیں کُلیتاً آپ کے ساتھ ہوں۔ اگرچہ اُردو زبان کی بہ حیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔" (اقبال اور عبدالحق ص ۴۲)

آپ کی تحریک سے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے۔ بہت سے اعتبار سے یہ تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سرسیّد رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔

(اقبال اور عبدالحق ص ۴۷)

"اُردو کی اشاعت اور ترقی کے لیے آپ کا دِلّی میں نقل مکانی کرنا بہت ضروری ہے معلوم نہیں آپ کے حالات ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں، کاش میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اُردو کی خدمت کر سکتا۔"

(اقبال اور عبدالحق ص ۴۷)

"میں نے سنا ہے کہ مُسلم لیگ کی طرف سے آپ کو بھی لکھنو آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ براہ عنایت اس سفر کی زحمت ضرور گوارا فرمایئے۔ اُردو کے متعلق اگر لیگ کے کھلے سیشن میں کوئی مناسب قرارداد منظور ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس کا اثر بہت اچھا ہو گا۔" (اقبال اور عبدالحق ص ۵۱، اکتوبر ۱۹۳۷ء)

"اُردو زبان کے تحفظ کے لیے جو کوششیں آپ کر رہے ہیں ان کے لیے مسلمانوں کی آئندہ نسلیں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔" (اقبال اور عبدالحق ص ۵۰)

علاّمہ نے ان جملوں میں حقیقت واضح کر دی ہے کہ اُردو اور اس کی تحریک سے انہیں دِلی وابستگی تھی۔ اور وہ اس زبان کو مسلمانوں کی زندگی میں قومی اعتبار سے ایک اہم کام انجام دیتے ہوئے دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ انہوں نے یہ سب کچھ لکھ کر نہ صرف اپنے جذبات و احساسات کو واضح کیا ہے بلکہ تمام اسلامیان ہند کے واردات قلبی و ذہنی کی ترجمانی کی ہے۔ اس حقیقت سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ علاّمہ

کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اسلامیان ہند کے ذہن اور قلب و جگر کا ترجمان [illegible]
ہوا کرتا تھا۔

(۴)

یہ صورت حال تھی کہ ۱۹۴۷ء میں دُنیا کے نقشے پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت
ابھر کر سامنے آگئی۔ جو خواب علامہ اقبالؒ نے دیکھا تھا اس کو قائدِ اعظم کی سیاسی بصیرت
نے حقیقت بنا دیا۔ اب برِعظیم کے مسلمان ایک ملک کے مالک تھے۔ اس کے آزاد شہری
تھے جہاں وہ اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی حفاظت کر سکتے تھے۔ اب انہیں یہ خطرہ
لاحق نہیں تھا کہ ان کی تہذیب اور زبان کو ختم کر دیا جائے گا یا اس کی صورت مسخ کر
دی جائے گی۔

قائدِ اعظم نے اپنی سیاسی بصیرت اور عوام کے تعاون سے قوم کے لیے جس اسلامی
مملکت کی تعمیر کی تھی اس کے تقاضوں کا انہیں پوری طرح احساس تھا۔ وہ اس بات کا
بھی گہرا شعور رکھتے تھے کہ یہ ایک قوم ہے جس کے لیے یہ وطن حاصل کیا گیا ہے۔ ایک
زبان اس کی بنیادی ضرورت ہے جو اب بکھرے ہوئے لوگوں کو ایک رشتے میں
منسلک کر سکے اور جو ان کے لیے وحدت، ایک جہتی اور یگانگت کی بنیاد بن جائے۔
چنانچہ انہوں نے واضح طور پر ایک بار نہیں کئی بار یہ اعلان کیا کہ اس نئی مملکت پاکستان
کی قومی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی۔ اور ان کا یہ فیصلہ نہایت دانشمندانہ اور حقیقت
پسندانہ فیصلہ تھا۔

لیکن پاکستان جس وقت سے وجود میں آیا اسی وقت سے بعض نادان اور
جاہل لوگوں کے ہاتھوں براہ راست یا بالواسطہ اس کی مخالفت بھی ہوتی رہی۔ لوگ
دشمنانِ پاکستان کی ان چالوں کو نہ سمجھ سکے اور سطحی باتوں میں اُلجھ کر ایسی باتیں بھی کرنے
لگے جو قومی زندگی کے لیے سم قاتل تھیں۔ چنانچہ بنگال میں جو کچھ ہوا وہ نادانی، جہالت اور
غداری کی ایک نہایت ہی المناک داستان ہے۔ میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا

کیونکہ یہ ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔

اس رویے سے ہمارے وطن عزیز میں جو تاریکی پھیلی اس میں قائد اعظم کے خیالات زریں ہمارے لیے ہمیشہ مشعل راہ کا کام دیتے رہے ہیں۔ انہوں نے واضح الفاظ میں قومی زبان کے بارے میں جو بات کہی تھی وہ یہ تھی :۔

"میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی، اور کوئی دوسری زبان نہیں ہوسکتی۔ جو کوئی اس معاملے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ صریحاً پاکستان کا دشمن ہے"

ان کی زندگی میں کس کی جرأت تھی کہ ذرا بھی چوں کرتا۔ سب نے اس کو تسلیم کیا۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ ان کا سایہ ہمارے سر سے جلد اٹھ گیا۔ لیکن جن خیالات کی قندیلیں انہوں نے روشن کی تھیں وہ برابر روشن رہیں۔ قائد ملت لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، فضل الرحمن اور سردار عبدالرب نشتر اور دوسرے سیاسی رہنما باوجود سیاسی مخالفت کے اُردو کو قومی زبان بنانے کی حمایت کرتے رہے۔ لیکن سیاست وقت کے ساتھ ساتھ بگڑتی گئی۔ سازشوں کے جال بچھا دیے گئے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں میں کُشتیاں لڑی جانے لگیں۔ دنگل شروع ہوگئے۔ اس میں ہمارے بیرونی اور اندرونی دونوں دشمنوں کا ہاتھ تھا۔ مستقبل کا مورّخ جب اس کی تفصیل لکھے گا تو اس کوشش کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جایا کریں گے۔

اس صورت حال نے ہماری قوم کو مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی پر بھی مجبور کیا چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس ملک کی دو قومی زبانیں قرار دے دی گئیں۔ ایک اُردو دوسری بنگالی۔ اس سے جو نقصان ہماری قومی زندگی کو پہنچا اس کی تفصیل نہایت اندوہناک ہے۔ ہر پاکستانی کو اس کا علم ہے۔ اس لیے تفصیل میں جانے کا کچھ فائدہ نہیں۔

وہ تو کہیئے کہ اس سارے المیے کے بعد ہماری بساط سیاست پر ایسے نوجوان سیاسی رہنما رونما ہوئے جنہوں نے اپنی ذہانت، دانائی اور بصیرت سے جگر لخت لخت کو ایک بار پھر جمع کرنے کی کوشش کی اور ہم جو سب کچھ کھو کر غیر یقینی کیفیت کے عالم میں پا بہ زنجیر

تھے اس میں ان رہنماؤں نے ہمیں روشنی کی کرن دکھائی۔ ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا، اور قوم کی تعمیر نو کے لیے ایسے اقدامات کیے جن کو تاریخ ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھے گی۔ انہوں نے ایک شکست خوردہ اور منتشر قوم کی شیرازہ بندی کی۔ اس کے پاس آئین نہیں تھا اس کو ایک باقاعدہ آئین دیا۔ اسمبلیاں بنائیں وزارتیں قائم کیں، اور اس طرح ایک جمہوری نظام قائم کر کے ہماری قوم میں ایک استواری پیدا کی۔ اور یہ سب کچھ ایک شخص کی بے اندازہ بصیرت اور ذہانت ان تھک محنت، اور کام کرنے کی لگن کے ہاتھوں ہوا۔ ورنہ ہم تو بین الاقوامی سازشوں کے ہاتھوں اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

پاکستان کے اس نئے آئین میں واضح طور پر اُردو کو قومی زبان قرار دیا گیا اور پہلے دن ہی سے اس پر عملدرآمد بھی شروع ہو گیا۔ چنانچہ صدر پاکستان، وزیر اعظم اور دوسرے وزیروں نے حلف تک اس قومی زبان اُردو میں اٹھایا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے اُردو میں ایسی مہارت پیدا کی جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ان لوگوں نے جتنی تقریریں اُردو میں کی ہیں اتنی ماضی میں ہمارے سیاسی رہنماؤں نے نہیں کی ہوں گی اور گذشتہ چند سال میں تو اُردو بولنے میں جو کمال ان لوگوں نے حاصل کیا ہے وہ اس زبان کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی اور لگن کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

اردو صحیح معنوں میں قانونی اور آئینی طور پر پاکستان کی قومی زبان ہے، اور اس اعتبار سے اس کے سامنے ایک درخشاں مستقبل ہے۔ کیونکہ حکومت نے قومی سطح پر بعض اعلانات کر کے اور کچھ اصلاحات نافذ کر کے کم از کم اصولی طور پر ان جھگڑوں بحثوں اور سازشوں کا بڑی حد تک سدباب کر دیا ہے جو ہماری قومی زندگی کے لیے برسوں سے ایک عذاب بنے ہوئے تھے۔ نئی تعلیمی پالیسیوں کو جس طرح عملی صورت دی جا رہی ہے، اس کے اثرات مجموعی طور پر ہماری قومی اور تہذیبی زندگی کے لیے یقیناً خوشگوار ہوں گے، اور بلاشبہ قومی زبان بھی اس سے متاثر ہو گی۔

(۵)

یہ صحیح ہے کہ ابھی تک ہمارے ہاں انگریزی کے اثرات بہت گہرے ہیں، اور یہ اثرات بڑی حد تک قومی زبان کی ترقی میں حائل ہوئے ہیں اور ایمان کی بات یہ ہے کہ آج بھی حائل ہو رہے ہیں۔ دفتروں اور عدالتوں کی اونچی سطح پر بیشتر دفتری کام انگریزی میں ہو رہا ہے۔ البتہ نچلی سطح پر قومی زبان اُردو استعمال کی جا رہی ہے۔ نظام تعلیم میں بھی، جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے، ابھی تک انگریزی سے کام لیا جا رہا ہے لیکن نچلی سطح پر بلکہ انٹرمیڈیٹ اور بی اے تک انگریزی کی جگہ اُردو نے لے لی ہے۔ بعض یونیورسٹیوں نے ایم۔ اے کی سطح تک امتحان کے جواب اُردو میں لکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن اس کے باوجود انگریزی کے اثرات ابھی تک خاصے گہرے ہیں اور ان اثرات کے کم ہونے کی بظاہر ابھی کوئی توقع نہیں۔

بات یہ ہے کہ انگریزی ڈیڑھ دو سو سال سے ہمارے سروں پر مسلط ہے اور مجموعی طور پر ذہنی اعتبار سے ہماری قوم انگریزی کے رنگ میں اس طرح رنگ چکی ہے کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا آسان نہیں۔ جہاں لوگوں کی تعلیم ابتدا ہی سے انگریزی ماحول میں ہوئی ہو جہاں چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے انگریزی سے سابقہ ہو، جہاں ہر وقت انگریزی الفاظ اور انگریزی فقرے کانوں میں پڑتے ہوں جہاں انگریزی اخبار، انگریزی رسالے، انگریزی کتابیں پڑھنا نہ صرف ضرورت ہو بلکہ فیشن میں داخل ہو گیا ہو جہاں انگریزی لہجے میں اُردو بولنے کو معیار سمجھا جاتا ہو، وہاں انگریزی سے چھٹکارا اتنا آسان نہیں جتنا کہ اُردو کے بعض نادان دوست خیال کرتے ہیں۔

تاریخ کا ہاتھ بڑا ظالم ہوتا ہے۔ اس کا جادو سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ ہماری تاریخ نے جو اثرات ہم پر چھوڑے ہیں، ان کو ایک مستقل منصوبہ بندی ہی زائل کر سکتی ہے۔ اس کے لیے نظام تعلیم میں عملی طور پر بنیادی تبدیلیاں ضروری ہیں۔ افسوس ہے کہ اپنی قومی زندگی کے گذشتہ تیس برسوں میں ہم اس سے محروم رہے ہیں [illegible]

کہ آزادی کے بعد بھی ہم اس نظام تعلیم کے ساتھ چمٹے رہے جس کی منصوبہ بندی آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل میکالے نے کی تھی اور جس کا مقصد انگریزوں کی حکومت کو چلانے کے لیے ایسے پڑھے لکھے مقامی لوگوں کا پیدا کرنا تھا جو انگریزی زبان انگریزی تہذیب اور انگریزی طرز معاشرت کو افضل اور برتر سمجھتے ہوں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی میں بھی اس کا احساس نہیں ہوا۔ ہم اس پر افسوس کریں یا شرم سے اپنی گردنیں جھکالیں کہ مغربی طرز کے اسکول اب بھی ہمارے ہاں باقی ہیں جن کو عیسائی مشنری چلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو ہماری تعلیم سے زیادہ اپنے مشن کو کامیاب بنانے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے سے زیادہ دلچسپی ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ اسکول ابھی تک قومی تحویل میں بھی نہیں لیے گئے ہیں۔ ان اسکولوں کو چلانے والے ہم سے فیسوں اور جرمانوں کی صورت میں بھاری رقم وصول کرتے ہیں، اور ہمارے بچوں کی شخصیت اور کردار پر مغربی رنگ کا ملمع چڑھا دیتے ہیں۔ اس کے نقوش ان پر اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ زندگی بھر ان کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ ان کی وجہ سے معاشرے میں طبقاتی تفریق کا احساس زیادہ نمایاں ہوتا ہے جس کو ختم کیے بغیر کوئی معاشرہ کسی مثبت قومی کردار کو پیدا نہیں کر سکتا۔

اُردو کے بعض نادان دوست اس صورت حال کو سمجھے بغیر یہ نعرے لگاتے ہیں کہ انگریزی کو ختم ہونا چاہیئے۔ دفتروں سے اس کو یک قلم خارج کر دو۔ انگریزی مت بولو۔ کاروبار میں انگریزی استعمال نہ کرو۔ بورڈ انگریزی میں نہ لگاؤ، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ ان کی آواز میں وزن نہیں ہوتا اس لیے یہ آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ صدا صحرا ثابت ہوتی ہے، اور سوائے اپنے لیے وقتی اور سستی شہرت کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

انگریزی یقیناً ہمارے دور غلامی کی یادگار ہے۔ لیکن اس زبان سے جذباتی طور پر نفرت کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ سوائے اس کے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو تن آسانی بنا دیں، اور ان کی ذہنی کیفیت یہ ہو جائے کہ اب انہیں انگریزی جاننے، انگریزی پڑھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُردو کو تو ظاہر ہے کہ وہ گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں، اس لیے

اس میں مہارت حاصل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بیشتر نوجوان آج کل اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔ نہ انہیں انگریزی آتی ہے نہ اُردو۔ ایسے لوگوں کی کیفیت تو یہ ہے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

نادانی ہوگی اگر ہم اس حقیقت کو فراموش کر دیں گے کہ انگریزی اب ایک بین الاقوامی زبان ہے، اور بین الاقوامی سطح پر کاروبار کو چلانے، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور سائنس و علمی تحقیق سے استفادہ کرنے کے لیے اس زبان میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس معاملے میں تعصب برتنا ہماری قومی زندگی کے لیے بے حد مضر ہو سکتا ہے، زبانوں کے ساتھ تعصب برتنا مہذب قوموں کا شیوہ نہیں۔ البتہ اپنی قومی زبان کی اہمیت کو محسوس کرنا اس کو علمی اعتبار سے مالامال کرنا، معراج کمال پر پہنچانا دفتروں میں رائج کرنا اور تعلیم کی ہر سطح پر اس کو ذریعۂ تعلیم بنانا افراد کا فرض اولین ہے۔ اور اس کے لیے ایک متوازن ذہن ایک جذب صادق اور ایک مثبت زاویۂ نظر کی ضرورت ہے۔ کاش یہ متوازن ذہن یہ جذب صادق اور یہ مثبت زاویۂ نظر ہماری قوم کے افراد میں موجود ہوتا اور وہ اس سے کام لے کر اپنے نظام تعلیم کو صحیح بنیادوں پر قائم کرتی اور قومی زبان کو ہر سطح پر رائج کرنے کا منصوبہ بناتی!

٦

متوازن ذہن، جذب صادق اور مثبت زاویۂ نظر نہ ہونے کی وجہ سے ہماری کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ ہم خود تو نہ کچھ کرتے ہیں نہ سوچتے ہیں، حکومتوں کو الزام دیتے ہیں، اپنے رہنماؤں کی پگڑیاں اچھالتے ہیں اور اس طرح اپنی قومی زندگی کو انتشار سے دوچار کرتے ہیں۔ برسوں سے ہمارے ہاں یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری قومی تاریخ میں ایسے دور بھی آئے ہیں جب ہم تعمیر تو درکنار حسرت تعمیر تک سے محروم رہے ہیں۔ قائد اعظم سے لے کر قائد عوام تک اپنی قومی زندگی کے نشیب و فراز کی جو تصویر میں نے کھینچی ہے اس کو سامنے رکھا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ ہمارے تمام معقول رہنماؤں نے اپنی اپنی جگہ قومی تعمیر میں حصّہ

لیا کبھی کبھی سیاسی پیچیدگیوں اور دشمنان پاکستان کی سازشوں کے باعث وہ مصلحت اندیشی سے کام لینے کے لیے ضرور مجبور ہوئے لیکن قوم کے ساتھ ان میں سے کسی نے جان کر دشمنی نہیں کی۔ کسی نے اس کی پیٹھ میں چھرا نہیں بھونکا۔ خصوصیت کے ساتھ قومی زبان کو رائج کرنے اور اس کے منت پذیر پریشانہ گیسوؤں کو سنوارنے کے سلسلے میں، میری ناچیز رائے میں، سب کے پاس جذب صادق تھا، اور سب اس جذبے سے سرشار تھے کہ پاکستان کو ایک عظیم قوم اور اس کی قومی زبان کو ایک عظیم زبان ہونا چاہیئے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو اُردو کے لیے جو کام پاکستان میں گذشتہ تیس سال کے اندر ہوا ہے وہ کبھی بھی نہ ہوتا۔ آپ یہ دیکھئے کہ قیام پاکستان کے بعد اُردو کی ترقی اور فروغ کے لیے بے شمار ادارے بنے اور ہماری حکومتوں نے ان سب کی حمایت کی۔ کراچی میں انجمن ترقی اردو میں از سر نو جان ڈالی گئی، اور بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو عزت اور احترام کے ساتھ اُردو کی ترقی کا کام کرنے کے لیے سہولتیں فراہم کی گئیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں اُردو کی علمی اور ادبی کتابیں انجمن نے شائع کیں۔ کراچی یونیورسٹی میں ادارہ تالیف و ترجمہ کا قیام عمل میں آیا جس نے سائنس کی ہزارہا اصطلاحات بنا کر شائع کر دیں۔ ترقی اُردو بورڈ کی داغ بیل ڈالی گئی جس نے اردو کی عظیم لغت تیار کرنے اور اس کو شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اُردو کی نادر و نایاب کتابیں بھی شائع کیں۔ لاہور میں پنجاب کی صوبائی حکومت نے مجلس زبان دفتری قائم کی جس نے دفتری اصطلاحات کو بنانے کا عظیم کارنامہ انجام دیا اور یہ اصطلاحات کئی صورتوں میں شائع ہوئیں اور اب حکومت پنجاب نے ان اصطلاحات کو باقاعدہ ایک لغت کی صورت میں شائع کر دیا ہے اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو اس کی جلدیں فراہم کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت پنجاب نے مجلس ترقی ادب بھی قائم کی جس نے اُردو ادب کی بے شمار نادر و نایاب کتابیں شائع کیں، اور تقریباً تمام کلاسکی ادب کو محفوظ کر دیا۔ وفاقی حکومت پاکستان نے لاہور میں ایک مرکزی ترقی اردو بورڈ قائم کیا، جس نے مختلف علمی، لسانی، ادبی اور تاریخی کتابوں کی اشاعت کا عظیم منصوبہ بنایا اور ضخیم کتابیں شائع کر کے اردو کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا۔

پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج نے بھی وفاقی حکومت پاکستان اور حکومت پنجاب کی امداد سے اُردو کی اشاعت کے عظیم منصوبے بنائے۔ اور ادب اور تاریخ ادب کے مختلف پہلوؤں پر خاصی تعداد میں تحقیقی اور تنقیدی کتابیں شائع کیں۔ دائرہ معارف اسلامیہ (اردو انسائیکلوپیڈیا) کا کام گذشتہ پچیس سال سے جاری ہے اور خاصی تعداد میں ضخیم جلدیں اسلامی تاریخ اور تہذیب پر شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کی انیس جلدیں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ ادبیات کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں۔ یونیورسٹی کی مجلس یادگار غالب نے غالب کی تمام تصانیف کو نہایت اہتمام سے شائع کر دیا ہے، اور اورینٹل کالج اورینٹل پبلکیشنز فنڈ نے عربی، فارسی، اُردو، اور اسلامیات کے موضوع پر خاصی تعداد میں نادر و نایاب ضخیم کتابیں شائع کی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تالیف و ترجمہ کا کام بھی قابل قدر ہے جس نے سائنسی اصطلاحات اور سائنس کی درسی کتابوں کو شائع کرنے کا اہم کام انجام دیا ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی اکیڈمی، اکیڈمی پنجاب، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، بزم اقبال اور اقبال اکیڈمی نے بھی بے شمار کتابیں شائع کر کے اُردو کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ پشاور، کوئٹہ اور حیدرآباد میں پشتو اکیڈمی، سندھی ادبی بورڈ اور بلوچی اکیڈمی نے بھی جو کام کیا ہے اس میں بھی اُردو کا خاصا حصہ ہے۔

کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ ان اداروں کو وفاقی حکومت پاکستان اور صوبائی حکومتوں نے کتنی امداد دی ہوگی۔ جس کی بدولت یہ علمی ادبی کارنامے انجام پائے۔ صحیح اعداد و شمار میرے پاس اس وقت نہیں ہیں لیکن وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ کروڑوں بلکہ اربوں روپے کی گرانٹ ان تمام علمی اداروں کو حکومت نے گذشتہ پچیس سال میں دی ہوگی کیا یہ رقم آپ کے خیال میں قومی زبان اُردو کے منتشر یا پریشان گیسوؤں کو سنوارنے کے لیے نہیں دی گئی؟

یہ احسان فراموشی ہوگی اگر اس حقیقت کا اعتراف نہ کیا جائے کہ پاکستان کی مختلف حکومتوں نے قومی زبان کو فروغ دینے کے لیے کام نہیں کیا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہر اعتبار سے حکومت نے اس زبان کو سہارا دیا۔ اور اس کو علمی زبان بنانے میں ہمیشہ پیش پیش رہی اور آج ہم فخر کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اُردو [illegible]

عظیم زبان ہے اور اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن سے کسی ملک کی قومی زبان پہچانی جاتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں اس زبان اور اس کے ادب کی اتنی دھوم نہ ہوتی، مختلف ممالک کی اہم یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم کا معقول انتظام نہ ہوتا اور اقوام متحدہ بین الاقوامی سطح پر اس کو گنتی کی چند زبانوں میں شمار نہ کرتی۔

افسوس ہے تو اس بات کا کہ قومی زبان کی حیثیت سے جو تقاضے ہم سے کئے گئے تھے وہ ہم نے پورے نہیں کئے۔ ہم میں سے کتنے لوگوں نے قومی زبان سے وہ دلچسپی لی جو ایک زندہ قوم کے افراد کو اپنی زبان سے لینی چاہیئے۔ کتنے لوگوں نے اردو زبان و ادب سے دلچسپی کا اظہار کیا؟ کتنے خاندانوں نے اردو کی کتابیں خرید کر اپنے اپنے گھروں میں اردو پڑھنے کا ماحول پیدا کیا؟ ہم میں سے کتنے لوگوں نے اردو کے اشاعتی اداروں، ناشروں، تاجروں، ادیبوں، شاعروں اور علمی کام کرنے والوں کی اپنے فکر و عمل سے ہمت افزائی کی؟ ہم اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں گے تو یقیناً ہماری گردنیں شرم سے جھک جائیں گی اور یہ احساس ہمارے دل میں کچوکے سے لگائے گا کہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے جو کچھ ہمیں اپنی قومی زبان کے لیے کرنا چاہیئے تھا، وہ ہم نے نہیں کیا۔ ہم نے شور زیادہ مچایا، طعنہ زنی زیادہ کی، غم زیادہ کھایا، اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ یا پھر دولت کمانا اور اس سے اپنی تجوریوں کو بھرنا شروع کر دیا اور بالآخر خود پرستی اور خود نمائی، خود غرضی اور خود ستائی تنگ نظری، اور تعصب، مادہ پرستی اور تعیش پسندی میں ایسے ڈوبے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔ یہاں تک کہ خود اپنی بھی خبر نہ رہی۔

اس صورت حال نے وطن کی محبت کو دلوں سے دور کر دیا۔ قومی شعور کو ملیامیٹ کر دیا۔ افراد یا تو خوشامد اور چاپلوسی پر اتر آئے یا پھر انہوں نے مطالبات کو اپنا شعار بنا لیا۔ اجتماعات، کانفرنسیں، جلسے جلوس صرف اس مقصد سے ترتیب دیے جانے لگے کہ حکومت سے کچھ حاصل ہو جائے۔ ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ قومی زندگی میں تمام کام حکومتیں نہیں کرتیں، افراد کو بھی ان کاموں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں

جس وقت تک افراد میں قومی شعور بیدار نہ ہو، اور وہ قومی تعمیر میں مثبت زاویۂ نظر کو اپنا شعار نہ بنا لیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

یہ ہماری قومی زندگی کا المیہ ہے کہ ہم نے قومی زبان کے معاملے میں اس مثبت زاویے کو اپنا شعار نہیں بنایا، اس کی قومی اہمیت کو محسوس نہیں کیا، اس سے خاطر خواہ دلچسپی نہیں لی، اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر اس خیال میں مگن بیٹھے رہے کہ ان مسائل کو حل کرنا صرف حکومت کی ذمہ داری ہے، یا پھر یہ سوچتے رہے کہ وہ کسی غیبی مدد یا جادو کے زور سے حل ہو جائیں گے، ان مسائل کو حل کرنے کے لیے خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔

میر صاحب کا پہلو دار اور معنویت سے بھرپور شعر مجھے یاد آتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے۔

اس بزم خوش کے محرم نا آشنا ہیں سارے
کس سے کہوں کہ واں تک میری خبر کرو تم

اُردو زبان کے جدید رجحانات

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ زبان بلاشبہ ایک معاشرتی ضرورت ہے۔ یہی اس کی تخلیق کا باعث ہوئی اور وہ اس کی زندگی کا ایسا جزو ہے جو اس سے کبھی جُدا نہیں ہوسکتا۔ وہ انسان سے الگ کوئی شے نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں سے وابستہ ہے جو اسے بولتے اور اس میں فکر کرتے ہیں۔ اس کی جڑیں ہمارے دِل و دماغ اور جسم میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہیں سے اس کی نشو و نما ہوتی ہے۔ زبان کی ترقی و انحطاط معاشرتی حالات کے تابع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے لسانیات تمدن اور معاشرت کی تاریخ کو زبان کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں۔

یہ خیال معاشرتی اور لسانی بصیرت کو ظاہر کرتا ہے۔ زبان کا تعلق معاشرت اور تہذیب سے بہت گہرا ہے۔ اس کے بغیر دوسرے کا تصور بھی ناممکن ہے۔ زبان معاشرے کی آواز ہوتی ہے۔ اس معاشرے کے نشیب و فراز اس کی زبان کے رنگ و آہنگ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کے دل کی دھڑکنوں کی آواز زبان ہی میں سنائی دیتی ہے۔ معاشرہ اور زبان ایک دوسرے کا دامن پکڑ کر چلتے ہیں۔ زندگی کے راستے پر قدم مِلا کر چلنا ان کے مزاجوں میں داخل ہے۔ زبان معاشرے کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتی اگر چھوڑ دے تو وہ زندہ نہیں رہتی مرجاتی ہے، ایسی ہی زبان کو مردہ زبان کہا جاتا ہے۔ اس مردہ زبان کی حیثیت معاشرتی عمل کی نہیں رہتی اور وہ صرف ایک عجائب خانے میں رکھنے کی چیز ہوجاتی ہے۔ لوگ اسے

دیکھتے ہیں، اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن اس کو استعمال نہیں کر سکتے۔ اس سے کام نہیں نکال سکتے۔ برخلاف اس کے جو زبان زندہ ہوتی ہے اس کے بغیر معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ معاشرے کو زندہ رکھتی ہے اور یہ سارا کارخانہ اسی کے دم سے چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی رفتار معاشرے اور تہذیب کی رفتار سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ وہ جن حالات سے دوچار ہوتا ہے، اور ان حالات کے نتیجے میں جو خصوصیات اس میں پیدا ہوتی ہیں ان سب کا عکس زبان میں نظر آتا ہے۔ افراد کے احساس میں وقت کے ساتھ ساتھ جو تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں اور شعور میں جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں، ان سب کی پرچھائیاں سی زبان پر پڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ معاشرے اور تہذیب کو ایک جگہ قرار نہیں۔ اس میں ہر لحہ تغیر کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور اس کے ساتھ زبان بھی اپنے آپ کو بدلتی ہے اور اس میں بھی نئے رجحانات کے پیدا ہونے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

یہ نئے رجحانات کئی صورتوں میں رونما ہوتے ہیں۔ زندگی جس انداز اور لب ولہجہ کا تقاضا کرتی ہے مروجہ زبان کو وہی انداز اور لب ولہجہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً جب معاشرے میں فکر وعمل کی کوئی تحریک ہوتی ہے اس کے افراد کے دلوں میں جذب وشوق کے چراغ فروزاں ہوتے ہیں۔ اس کا اثر زبان پر ہونا لازمی ہے۔ اس عالم میں زبان ایک جولانی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ اس میں ایک تیکھا پن پیدا ہو جاتا ہے اور ایک شوخی اور شگفتگی نظر آنے لگتی ہے۔ ایسے الفاظ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے جو زبان میں بلند آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی معاشرہ انحطاط وزوال سے آشنا ہوتا ہے اور اس کے افراد بے حسی کا شکار ہو جاتے ہیں تو اس کی زبان میں ایک بجھی ہوئی سی کیفیت کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ اس عالم میں زبان پر ایک اُداسی کا سا عالم چھا جاتا ہے۔ اور سوگواری کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ زبان میں مخصوص الفاظ کا استعمال بھی حالات ہی کے تابع ہوتا ہے۔ نئے الفاظ بھی حالات ہی کی تبدیلی کی بدولت زبان میں داخل ہوتے ہیں اور اس کا جزو بن جاتے ہیں۔ بعض الفاظ کو اپنی شکل بھی بدلنی پڑتی ہے۔ بعضوں کا صرف لباس تبدیل ہوتا ہے۔ بعضے محفل سے اٹھا دیے جاتے ہیں اور

زبان سے ان کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ یہ زبان دوسری زبانوں کے اثرات بھی قبول کرتی خصوصیت کے ساتھ ان زبانوں کے اثرات جن کا براہ راست اس سے تعلق ہوتا ہے اور جن کے ساتھ وہ مل جل کر رہنے کے لیے مجبور ہو جاتی ہے۔ آس پاس اور گرد و پیش بولی جانے والی بولیوں کا بھی اس پر اثر ہوتا ہے۔ جب کبھی ان بولیوں کی اہمیت بڑھتی ہے، اور افراد ان میں زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں، تو ان اثرات میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ نئے افکار و خیالات کا بھی زبان پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ جب افراد میں نئے تصورات عام ہوتے ہیں اور ان کو عام کرنے کے لیے جب کسی تحریک کا سوتا پھوٹتا ہے، تو زبان اپنی جگہ اس سے بھی متاثر ہوتی ہے۔ بہت سے نئے الفاظ اس راستے سے زبان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کے آہنگ و انداز میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اور مجموعی طور پر اس کا میدان بھی وسیع ہونے لگتا ہے۔ نئی ادبی تحریکوں کے اثرات بھی زبان قبول کرتی ہے اور ادب کے نئے رجحانات کا بھی اس پر اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ ان تحریکوں اور رجحانات کے زیر اثر اظہار و ابلاغ کے نئے سانچے بنتے ہیں۔ نئے احساسات کا وجود ہوتا ہے۔ نئی فکر جنم لیتی ہے۔ نئے نظریات پھیلتے ہیں۔ ان سب پر اظہار خیال کے لیے زبان کا ظرف اپنے آپ میں وسعتیں پیدا کر لیتا ہے۔ نئے سانچے بنتے ہیں الفاظ میں نئی معنویت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مجموعی طور پر ایک نیا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ نئے نئے علوم سے واقفیت بھی زبان میں تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔ ان علوم کے اثر سے زبان میں سنجیدگی، وقار اور رکھ رکھاؤ کا وجود ہوتا ہے۔ وہ کسی حد تک مشکل بھی ہو جاتی ہے۔ نئے علوم سے متعلق خیالات و نظریات کو پیش کرنے کی غرض سے اس میں بے شمار الفاظ استعمال ہونے لگتے ہیں۔ خاصی تعداد میں علمی اصطلاحیں تیار کی جاتی ہیں جن سے زبان شروع شروع تو مانوس نہیں ہوتی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ سب کی سب اس کے ساتھ شیر و شکر ہو جاتی ہیں۔ مختلف قوموں سے میل جول کا اثر بھی زبان پر بہت ہوتا ہے۔ اس میل جول کی نوعیت سیاسی تہذیبی اور ثقافتی ہوتی ہے اور اس سے زبان میں بعض عجیب و غریب تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ان قوموں کی زبان کے بے شمار الفاظ زبان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

عمومی طور پر دیکھا جائے تو طرزِ اظہار، اندازِ بیان اور لب و لہجے پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔
جب یہ تبدیلیاں شدت اختیار کر لیتی ہیں تو ان کا نمایاں اثر یہ ہوتا ہے کہ زبان اپنے آپ کو
کچھ اس طرح بدلنا شروع کر دیتی ہے کہ افراد کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن تغیر کا یہ
عمل اندر ہی اندر جاری رہتا ہے۔ جو لوگ زبان کے مزاج داں ہیں وہ اس کے نشیب و فراز
کی اندازہ دانی کا شعور رکھتے ہیں، ان کی نظریں اس تبدیلی کو محسوس کر لیتی ہیں، اور جب یہ
تبدیلی مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ زبان نئے رجحانات
سے آشنا ہے۔ لیکن ان نئے رجحانات کا اثر زبان کے عام مزاج پر نہیں ہوتا۔ ان تبدیلیوں
کے باوجود وہ اپنے خصوصی مزاج کو نہیں بدلتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بنیادی خصوصیات ان
نئے رجحانات سے آشنا ہونے کے باوجود اپنی جگہ پر قائم اور باقی رہتی ہے بات یہ ہے کہ زبان
کا رشتہ تہذیبی روایت سے استوار ہوتا ہے اور اس کی جڑیں اس روایت کی زمین میں
دُور دُور تک پیوست ہوتی ہیں۔ زبان اسی روایت کی زمین سے زندہ رہنے کے لیے
غذا حاصل کرتی ہے اس روایت سے دامن چھڑا لینا کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی
نہیں آتا۔

اُردو زبان بھی اپنے ارتقاء میں کچھ اسی صورت حال سے دوچار رہی ہے۔ اس کا
وجود ہی درحقیقت تغیر کے اس عمل کا نتیجہ ہے جو زندگی میں جاری رہا ہے۔ اس کی ابتدا
ہی تبدیلی کے فلسفے کے نتیجے میں ہوئی ہے جس سے زندگی ہمیشہ دوچار رہتی ہے۔ اس
برعظیم کی تاریخ میں اُردو کی پیدائش ایک اہم تہذیبی واقعہ ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے اس
سرزمین پر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے، جن کے باعث یہ نئی زبان پیدا ہوئی۔ لسانیات پر
لکھنے والوں نے اس سلسلے میں مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ کسی نے کہا یہ برج بھاشا
سے نکلی ہے۔ کسی نے کھڑی بولی اور مغربی ہندی کو اس کا منبع بتایا ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ
برج بھاشا ہی نے فارسی کے اثر سے اس زبان کی صورت اختیار کر لی۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ
یہ ایک ملی جلی زبان ہے اور کئی زبانوں نے مل کر اس کو بنایا ہے۔ یہاں اس سے بحث

نہیں کہ ان میں سے کون سا نظریہ صحیح ہے۔ دیکھنا تو صرف یہ ہے کہ اُردو زبان نے ایک ایسے لسانی ماحول میں آنکھ کھولی جہاں بہت سی بولیاں ایک نئی زبان کے پیدا ہونے کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ یہ خیال کہ اُردو کی داغ بیل صرف مسلمان حملہ آوروں کے ہندوستان میں آنے کے وقت ہی سے پڑی صحیح نہیں ہے۔ اس کی بنیاد تو اس سے بہت پہلے پڑ چکی تھی اور برعظیم ہند و پاکستان کے مختلف علاقوں میں جو لوگ مسلمانوں سے قبل تاجروں یا حملہ آوروں کی حیثیت سے آتے رہے تھے انہوں نے ایک نئی زبان کے پیدا ہونے کا بیج بو دیا تھا۔ مسلمانوں کے اس سرزمین پر باقاعدہ اقامت اختیار کر لینے سے اس عمل میں تیزی شروع ہوئی اور اس طرح اُردو کی داغ بیل پڑی۔

ابتدا میں اُردو کی یہ شکل نہیں تھی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ مختلف علاقوں میں اس کی مختلف شکلیں تھیں، مثلاً دکن میں یہ دکنی زبان کہلاتی تھی اور اس کی شکل بھی اس اردو سے مختلف تھی جو آج بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس دکنی زبان کا سلسلہ بہمنی بادشاہوں کے وقت سے شروع ہوا لیکن جو شکل اس کی اس وقت تھی وہ قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کے زمانہ میں بدل گئی اور جب مغلوں نے دکن کو فتح کیا تو اس میں ایک اور بھی انقلابی تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ولی کے زمانے کی زبان اس تبدیلی کو واضح کرتی ہے۔ اسی طرح شمال مغربی علاقوں میں اس نے کئی روپ بدلے۔ جس بولی کو پنجابی کہا جاتا ہے یہ بھی درحقیقت اُردو ہی کی ابتدائی شکل ہے جو ابھی تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس بولی نے بھی مختلف علاقوں میں مختلف شکلیں اختیار کیں۔ یہاں تک کہ ہر پچاس میل کے بعد اس میں فرق نظر آنے لگتا ہے۔ بعض علاقوں کی پنجابی اردو سے بہت قریب ہے لیکن بعض علاقوں میں ایسی زبان بولی جاتی ہے جس کا بظاہر اُردو سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو وہ بھی اُردو ہی کی ابتدائی شکل معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال اُردو نے پیدا ہو کر مختلف علاقوں میں مختلف خصوصیات پیدا کیں۔ دِلّی اور اطراف دِلّی میں جو زبان بنی صرف وہ معیاری زبان سمجھی گئی کہ یہی مسلمانوں کا تہذیبی مرکز تھا۔ یہاں تبدیلی کا وہ عمل پوری شدّت کے

ساتھ جاری رہا جو اس برعظیم کے لسانی ماحول میں شروع ہی سے جاری تھا۔ مورخوں کا خیال ہے کہ شاہ جہان کے زمانے میں اُردو زبان لشکر اور عوام میں بولی اور سمجھی جانے لگی تھی۔ اور پھر اورنگ زیب کے زمانے میں تو اس کا خاصا رواج ہو گیا تھا۔ اس کی ترقی کا زمانہ درحقیقت یہی زمانہ ہے جو اورنگ زیب کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے۔ محمد شاہ کے زمانے میں یہ زبان ادبی زبان بن چکی تھی۔ لوگ اس میں شعر کہنے لگے تھے۔ اگرچہ نثر لکھنے کا رواج پوری طرح نہیں ہوا تھا لیکن پھر بھی نثر لکھنے کی طرف بعض لوگ توجہ کرنے لگے تھے۔ اس میں بھی یہ زبان خاصی منجھی ہوئی صورت میں نظر آتی ہے اور اس کی یہ منجھی ہوئی صورت درحقیقت اس تبدیلی ہی کا نتیجہ ہے جو اس زبان میں برابر جاری رہی۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقت کے ساتھ اس میں نکھار پیدا ہو تا گیا۔ اس سلسلے میں بعض باقاعدہ تحریکیں ایسی ملتی ہیں جنہوں نے لسانی اعتبار سے بڑا کام کیا ہے۔

ولی غزل کا پہلا شاعر تھا جس نے حالات کے زیر اثر، ماحول کے تقاضوں کے پیش نظر اس میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کی جس سے ہندی کا وہ اثر کم ہوا جو دکنی میں غالب تھا اور اس کی جگہ فارسی کے اثرات نمایاں ہوئے۔ پھر شمالی ہندوستان میں شاہ حاتم نے پھر سودا، میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے اس میں تبدیلیاں کیں، لیکن ان تبدیلیوں میں ان کی شعوری کوششوں کو دخل کم تھا۔ حالات ہی کچھ ایسے پیدا ہوئے جن کی وجہ سے ان کے ہاتھوں اس زبان میں تبدیلیاں ہوئیں۔ غرض اُردو کی لسانی تاریخ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ یہ زبان ہمیشہ بدلتی رہی اور یہ کہ اس تبدیلی کی نوعیت تہذیبی اور تمدنی ہے جس کو حالات کی تبدیلی نے پیدا کیا۔ بڑی بڑی شخصیتیں اس تبدیلی کو پیدا کرنے میں پیش پیش رہیں۔ اور کبھی کبھی تو ان کی کوششوں نے تحریکوں کی صورت بھی اختیار کر لی۔ دِلّی میں غالبؔ، مومن، ذوق اور شاہ نصیر اور لکھنؤ میں ناسخ اور آتش ان تحریکوں کے علم بردار ہیں جنہوں نے اُردو زبان کو بدلا اور اس کو اہم تبدیلیوں سے ہمکنار کیا۔

اردو میں سب سے اہم تحریک جس نے زبان کو بدلا ہے سرسید کی تحریک تھی۔

اس تحریک سے زبان کے جدید رجحانات کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس سے قبل جو تبدیلیاں ہوئیں تبدیلیاں تو کہا جاسکتا ہے لیکن ان کو نئے انقلابی رجحانات سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ان کی حیثیت انقلابی تحریکوں کی نہیں تھی۔ مثلاً سرسیّد کی تحریک سے قبل فورٹ ولیم کالج میں اُردو زبان کو آسان اور سادہ بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ اس کام کے لیے اُردو کے لکھنے والوں کو جمع کیا گیا۔ ان سے کتابیں لکھوائی گئیں لیکن اس میں عوامی کوششوں کو دخل نہیں تھا۔ اسی لیے یہ کوششیں رُجحانات اور تحریکوں کی صورت اختیار نہ کرسکیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں غالب نے آسان اور سادہ نثر کو رواج دیا۔ ان کے خطوط اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی ایک انفرادی کوشش تھی۔ زبان پر اس کا اثر کسی رُجحان کی صورت میں نمایاں نہیں ہوا۔ بس ایک نمونہ بعض لوگوں کے سامنے آگیا۔ آگے چل کر انھوں نے اس سے استفادہ کیا۔ لیکن ان کا یہ طرز اس زمانے میں عام نہ ہوسکا۔ اس کی حیثیت ایک انفرادی کوشش ہی کی رہی۔ کیونکہ اُس کے بعد بھی ایک زمانے تک تہذیبی اور کاروباری زبان فارسی ہی رہی۔ سرسیّد کی تحریک واحد ایک ایسی کوشش تھی جس نے ایک لسانی انقلاب پیدا کیا۔ اور اس تحریک نے اُردو زبان کو عوام تک پہنچایا۔ اظہار کے لیے سادہ اور آسان نثر کو رواج دیا ورنہ اس سے قبل تو مسجع اور مقفیٰ عبارت لکھی جاتی تھی۔ لوگ گفتگو تک میں ضلع جگت سے کام لیتے تھے۔ سرسیّد کی تحریک کے زیر اثر اردو ایک ادبی زبان بھی بنی۔ سرسیّد کے رفقاء نے اس کو مختلف اصناف ادب کے لیے استعمال کیا۔ انگریزی زبان کے نمونے اُن کے سامنے تھے۔ اس لیے ان لوگوں کو اس اہم کام میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ علوم کا اثر بھی اس زمانے میں اُردو زبان نے قبول کیا۔ غرض سرسیّد کی تحریک نے اُردو زبان میں وسعتیں پیدا کیں اور اس کو بعض بالکل نئی راہوں سے آشنا کیا۔ اس تحریک کے زیر اثر زبان نے جو صورت اختیار کی اس میں سنجیدگی اور سادگی سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ آگے چل کر بیسویں صدی میں اس کا ردّ عمل ہوا جب سرسیّد کی تحریک کے ردِّ عمل کے طور پر اُردو میں رومانیت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس رومانی

تحریک نے اُردو زبان میں شوخی اور شگفتگی، رنگینی اور پُرکاری کو رواج دیا۔ کوئی ایک چوتھائی صدی تک یہ زبان اس تحریک کے زیر اثر رہی۔ لیکن پھر اس کا بھی رد عمل ہوا، اور ترقی پسند نے اس کو زیادہ آسان اور سادہ بنانے کی کوشش کی لیکن ادبیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس زمانے میں شاعری، افسانہ اور تنقید میں جو ترقی ہوئی۔ اُس نے زبان میں بڑا تنوّع پیدا کیا۔ یہ دور نئے اسالیب کو پیدا کرنے میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ غرض یہ مختلف تحریکیں تھیں جنہوں نے اُردو زبان میں مختلف تبدیلیاں کیں، اور زمانے کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس کو ایک مخصوص شکل دے دی۔ اسی شکل سے آج یہ زبان پہچانی جاتی ہے۔

برعظیم ہند و پاکستان کی تقسیم کے بعد اردو زبان کو ادبی اور لسانی اعتبار سے ایک عجیب و غریب صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ یہ ایک عام انقلابی تبدیلی ہے جس کے نتیجے میں اُردو زبان بعض نئے رجحانات اور نئے مسائل سے دوچار ہوئی ہے۔ اور اگرچہ ابھی ادبی اور لسانی اعتبار سے اس تبدیلی کے اثرات اس میں کم نظر آتے ہیں۔ البتہ اس تبدیلی کا عمل اس میں برابر جاری ہے لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ اس کے اثرات اس میں واضح طور پر نمایاں ہونے لگیں گے۔ آٹھ دس سال کے عرصے میں کوئی زبان ذرا مشکل ہی سے بدلتی ہے، تبدیلی کا عمل تو اس میں شروع ہوجاتا ہے لیکن وہ پوری طرح بدلتی نہیں۔ اس کے لیے تو کم از کم ربع صدی یا نصف صدی درکار ہے۔ اتنا زمانہ جب گذر جائے تب اس کی کوئی خاص شکل بنتی ہے۔

اُردو زبان اس وقت جس صورت حال سے دوچار ہے وہ تو یہ ہے کہ حالات نے اس کو اپنے وطن میں اجنبی بنا دیا ہے۔ جہاں یہ پیدا ہوئی وہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ حالات کچھ ایسے پیدا کیے گئے ہیں جن کی وجہ سے شاید کچھ زمانہ گذر جانے کے بعد اس زبان کے جاننے والے اور بولنے والے بھی خال خال نظر آئیں گے۔ کیونکہ نظامِ تعلیم کچھ اس طرح کا بنایا گیا ہے کہ اس میں اُردو کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کی نئی نسل جو اب ہندوستان میں پروان چڑھ رہی ہے، وہ اس زبان کے مزاج کو

نہیں سمجھ سکتی۔ ان کو اسکولوں میں ہندی پڑھائی جا رہی ہے اور یہ تصوّر ان کے ذہن میں راسخ جا رہا ہے کہ اُردو کوئی زبان نہیں ہے۔ زبان تو دراصل ہندی ہے۔ چنانچہ انہیں دیوناگری رسم الخط میں سنسکرت آمیز ہندی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور قدم قدم پر یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ یہی ان کی زبان ہے۔ اگر یہی لیل ونہار رہے تو آئندہ چند سال بعد نئی نسل میں سے اُردو کا کوئی ایک نام لیوا بھی پیدا نہ ہو سکے گا۔ جن لوگوں کی نشو و نما آج سے بیس پچیس سال قبل ہوئی وہ آج بھی اُردو پڑھتے اور اس سے دلچسپی لیتے ہیں، یہ نسل بھی دس بیس سال بعد کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔ ایسی صورت میں اُردو زبان اگر ہندوستان میں باقی رہی تو اس پر سنسکرت اور ہندی کی گہری چھاپ کا ہونا لازمی ہے۔ اور وہ باقی بھی اسی صورت رہ سکتی ہے کہ اس سے دلچسپی لینے والے اس کو باقی رکھنے کے لیے جدوجہد کریں حکومت سے ان کا یہ مطالبہ ہو کہ اس زبان کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ اور اپنے گھروں میں وہ ایک مذہبی جوش اور جذبے کے ساتھ اس زبان کو پڑھائیں۔ بہرحال اس وقت ہندوستان میں اُردو پر ایک نازک وقت ہے کیونکہ اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس حالت میں ہندوستان میں اُردو کا ایک ادبی زبان کی حیثیت سے باقی رہنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت جو گنے چنے ادیب موجود ہیں وہ کچھ زیادہ ہی جوش اور جذبے کے ساتھ ادبی تخلیقات کے ذریعے اس زبان کو بنانے سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور یہ ایک بالکل فطری بات ہے۔ لیکن آئندہ ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کا امکان کم ہے جو اس زبان کو ادبی زبان بنانے یا اس زبان میں ادبی تخلیقات پیش کرنے میں پیش پیش ہوں گے اور ادبی تخلیقات کو پیش کرنے میں جذب و شوق کا اظہار کریں گے۔ اس لیے وہاں زبان میں کسی نئے رُجحان کا پیدا ہونا ہی ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ اُردو اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے ہندی کے ساتھ کچھ اس طرح وابستہ ہو جائے کہ لوگ اُسے ہندی زبان کی ایک شاخ سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ اس عالم میں وہ انفرادیت کو خیرباد کہہ کر ہندی کے زیرِ اثر کچھ اس طرح آجائے گی کہ کچھ عرصے کے بعد اس کا پہچاننا بھی مشکل ہو جائے گا۔

ادھر پاکستان میں حالت یہ ہے کہ بہت سے لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے ہندوستان سے ہجرت کرکے یہاں آئے ہیں اور مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے ہیں۔ اپنے ساتھ اردو کی تمام روایات لائے ہیں۔ ان کے اثرات یہاں کی مقامی بولیوں پر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ یہاں اردو کسی علاقے کی مادری زبان نہیں۔ بلکہ ہر جگہ اپنی مقامی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ان مقامی بولیوں کا اثر اردو زبان پر ضرور ہونا چاہیئے۔ چنانچہ یہ اثر ہو بھی رہا ہے۔ جو لوگ پنجاب کے علاقوں میں آباد ہوئے ہیں ان کی نئی نسل پنجابی سے متاثر ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نئی نسل کی زبان میں پنجابی کے بہت سے الفاظ کا داخل ہونا عجیب نہیں۔ یہی حال سندھ میں آباد ہونے والوں کا ہے کہ وہاں کی زبان میں بھی سندھی زبان کا اثر کسی نہ کسی حد تک ضرور ہو رہا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شاید ایک صدی یا نصف صدی کے اندر، پاکستان میں اس میل جول سے کوئی نئی زبان پیدا ہو جائے گی۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ نئی زبان تو اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ملنے جلنے والی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہوں لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ پنجابی اور سندھی درحقیقت اردو کی ابتدائی شکلیں ہیں، جن کو مخصوص حالات نے مخصوص صورت میں باقی رکھا ہے۔ اس لیے اردو ہی یہاں اپنا عمل دخل پیدا کر سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقامی زبانوں کے اثرات قبول کرے اور اس قسم کے لسانی تعصب کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ زبان و لسان کا قانون بہت سخت ہوتا ہے۔ افراد تو افراد حکومتوں تک کا تعصب کسی زبان کو مختلف اثرات سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ اس وقت جو صورتِ حال ہے اس میں اردو پر مقامی زبانوں کا اثر ہونا لازمی ہے۔ اس اثر سے اس کی شکل بدل رہی ہے لیکن یہ تبدیلی اتنی آہستہ ہے کہ اس کا احساس بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ان اثرات کے نقوش زیادہ ابھر کر سامنے آتے لگیں گے۔ اس کا ایک سبب یہی ہے کہ جو لوگ ہمارے ملک میں مقامی زبان بولتے ہیں وہ بھی اردو

کو ... ثقافتی اور کاروباری زبان سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ قومی زبان بھی ہے۔ ...ں کو برتنا اور استعمال کرنا ان کے لیے ضروری ہے۔ ایسی صورت میں مقامی زبانوں کے اثرات کا گہرا رنگ اُردو پر چڑھنے کے امکانات ہیں، اور یہ سلسلہ آج کل برابر جاری ہے۔

یہ رُجحان بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس پر کُڑھتے ہیں خاص طور پر وہ لوگ جن کو حالات نے جذباتی بنا دیا ہے۔ جو اب اپنی زبان کو کسی طرح سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ زبان ایک زندہ چیز ہے۔ اس لیے اس پر مختلف اثرات کے دروازے کھلے رہنے چاہئیں۔ اردو زبان میں تو اس کی روایت بہت پرانی ہے۔ اس لیے مقامی زبانوں کے اثرات سے اُسے الگ رکھنے کی کوشش مستحسن نہیں ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اُردو کے نادان دوست ہیں۔ خود اردو زبان کا نظام اس کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اس زبان کی ساخت تو ایسی ہے کہ وہ ہر زبان سے اثرات قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ پھر پنجابی، پشتو اور سندھی تو اس کے اپنے خون سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ تمام زبانیں درحقیقت اُردو ہی کی ابتدائی شکلیں ہیں۔ حالات نے انہیں جُدا کر دیا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے وہ اب پھر یکجا ہو گئی ہیں۔ اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے۔ اس لیے بعض لوگوں کا اس میل جول کے راستے میں حائل ہونا اُردو کے حق میں دشمنی ہے۔ کیونکہ خود اردو زبان میں یہ تعصب نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس نے گذشتہ چند سال کے عرصے میں مقامی بولیوں کے بہت سے الفاظ کو اپنے مزاج میں داخل کرنا شروع کر دیا ہے۔ بولنے والی زبانوں میں تو بے شمار الفاظ استعمال ہونے لگے ہیں لیکن ابھی ادبی زبان میں ایسا کم ہو رہا ہے۔ پھر بھی شاعروں اور افسانہ نگاروں کی زبان میں بعض الفاظ استعمال ہونے لگے ہیں۔ بعض فقروں اور محاوروں نے بھی اس میں اپنی جگہ بنانی شروع کر دی ہے۔ ہر چند کہ یہ الفاظ، فقرے اور محاورے ابھی اس میں اپنی مستقل جگہ نہیں بنا سکے ہیں لیکن انہوں نے اس کو ایک نئے رجحان سے ضرور آشنا کر دیا ہے۔ ویسے اُردو زبان اپنے اصولوں میں بڑی سخت ہے۔ بڑی مشکل سے

یہ مختلف الفاظ، فقروں اور محاوروں کو اپنے مزاج میں داخل کرتی ہے۔ خاص طور پر اپنے محاوروں کو تو وہ کبھی بھی بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ سند بھی وہ اپنے تہذیبی مرکزوں سے ہی لیتی ہے اسی لیے جن لوگوں نے اس کے روزمرہ اور محاورے میں یہ سوچ کر تبدیلی کرنی چاہی ہے کہ اس کو شعوری طور پر اپنے سانچے میں ڈھال لیں اور اپنے شیشے میں اتارلیں انہیں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اب بھی کسی محاورے اور روزمرہ کی صحت کا جب سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے مرکزوں کی طرف لوٹتی ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اب مجموعی طور پر اس کا مزاج بدل رہا ہے اور اس میں ایک نمایاں تبدیلی ہو رہی ہے۔ یہ تبدیلی کسی نئی ادبی زبان کو پیدا کر سکے گی یا نہیں اس کا جواب تو مستقبل ہی دے گا۔ لیکن ویسے زبان کے تیور اس وقت یہی بتاتے ہیں کہ وہ ایک ایسی ادبی زبان بننے کی خواہشمند ہے جس کو نئی نسل اپنی ادبی تخلیقات کے لیے بغیر کسی جھجک کے استعمال کر سکے۔

اس وقت اردو زبان میں ایک جولانی کا احساس کارفرما ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے پاکستان میں ایک بہت بڑا سہارا مل گیا ہے۔ وہ اس ملک کی ایک قومی زبان بن گئی ہے۔ اس کی ترقی کے لیے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ اس کو آگے بڑھانے کا خیال عام ہو رہا ہے۔ افراد کے دلوں میں اس کی محبت کا ایک دریا موجزن ہے۔ اس صورت حال نے اس زبان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھا دیا ہے۔ وہ اپنی اہمیت کو محسوس کرنے لگی ہے۔ اسی لیے اس میں عوام سے قربت کا ایک رجحان بہت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سادگی اور سلاست کے راستے پر گامزن ہے۔ اس کے دامن میں وسعتیں بھی پیدا ہو رہی ہیں۔ اس میں نکھار بھی پیدا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بنا سنوار بھی رہی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ابھی اس کے آس پاس اور گرد و پیش انگریزی کا دور دورہ ہے کیونکہ ایک طبقہ ایسا ہے جو انگریزی کو کسی طرح بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اس طبقے نے تو انگریزی زبان کو سینے سے لگا رکھا ہے لیکن اس سے اردو کا دل میلا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ایک عوامی زبان ہے اور عوام تک اس کا پہنچنا ہی اس کا مقصد ہے۔ جمالیاتی تسکین کا سامان بھی وہ فراہم کر رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ انگریزی یہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔ مٹھی بھر افراد تو اس سے کام چلا سکتے ہیں اور وہ بھی دفتروں کا کام۔ قومی ذہانت و فطانت کا اظہار اس زبان میں نہیں ہو سکتا۔ وہ یہاں کی ادبی اور تہذیبی زبان نہیں بن سکتی۔ اس میں ادیب پیدا نہیں ہو سکتے۔ اردو کا حال اس سے بالکل ہی مختلف ہے۔ وہ ایک عوامی زبان کی حیثیت سے لوگوں کی ضروریات کو پورا کر رہی ہے اور پاکستانی معاشرے میں سارا کاروبار اسی زبان میں چل رہا ہے۔ وہ افراد کے ذوقی اور جمالیاتی تقاضوں کا سامان بھی فراہم کر رہی ہے۔ وہ ایک ادبی زبان بھی ہے۔ اس میں ادبی کام بھی ہو رہا ہے وہ افراد کے دلوں میں بھی جگہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور اس کی محبت کی شمع ہر فرد کے دل میں فروزاں ہے۔

اس لیے کہ وہ صرف پاکستان کی قومی زبان ہی نہیں اسلامیانِ ہند کی زبان بھی ہے۔ ایسی زبان جو ان کی تہذیب اور کلچر کی سب سے بڑی نشانی ہے۔

اُردو پر مغرب کے اثرات

اُردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس کی تاریخ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اس میں ہمیشہ مختلف زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے رہے اور ان الفاظ نے وقت کے ساتھ اس زبان کے نظام میں اپنی ایک مستقل جگہ بنالی۔ چنانچہ آج اُردو زبان کی جو تصویر ہمیں نظر آتی ہے اس میں مختلف زبانوں کے ان الفاظ کے بے شمار رنگ دکھائی دیتے ہیں اور اگر ان الفاظ کے مختلف رنگوں کو اس تصویر سے نکال لیا جائے تو یہ تصویر ہی باقی نہیں رہے گی۔ اس کی اصل، اس میں شبہ نہیں کہ ہندی بھاشا ہے۔ اسی بولی کے افعال پر اس کی بنیاد قائم ہے۔ لیکن اس زبان نے تاریخی تقاضوں کو اس طرح پورا کیا ہے کہ گذشتہ کئی سو سال میں اس نے ان تمام اثرات کو قبول کر کے جو تاریخی تبدیلیوں کے نتیجے میں برصغیر پر پڑتے رہے، اپنی شکل کچھ اس طرح بدلی کہ ہندی اور بھاشا کا اثر اس میں نسبتاً کم نظر آتا ہے۔ اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اپنے ارتقائی سفر میں اس نے فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی کے بے شمار الفاظ کو اپنے اندر داخل کیا۔ ان کی مخصوص شکلوں کو اس نے اپنے مخصوص سانچے میں ڈھال لیا۔ اُردو کا مزاج یہ ہے کہ وہ اجنبی اور نامانوس الفاظ کو اپنے رنگ میں اس طرح رنگتی ہے کہ وہ دوسری زبان کے الفاظ معلوم نہیں ہوتے بلکہ اُردو کے الفاظ بن جاتے ہیں ——— اس کا استعمال اس کا تلفظ، اس کا لگ و آہنگ اس کے قواعد، غرض ہر چیز اُردو کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ زبان ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے اور اس کے اس مزاج کو سامنے رکھے بغیر اس کے نظام

کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اُردو زبان نے فارسی زبان کی عظیم روایات کے زیر اثر ترقی کی ان گنت منزلیں طے کیں۔ یہی سبب ہے کہ اس زبان میں دوسری زبانوں کے مقابلے میں فارسی کے الفاظ بے شمار نظر آتے ہیں۔ عربی کے الفاظ براہِ راست اُردو زبان میں کم داخل ہوئے لیکن فارسی کے توسط سے وہ ضرور اس زبان میں آئے اور ان سب نے اپنی شکل کچھ ایسی بدلی کہ وہ اُردو زبان کے الفاظ بن گئے۔ اس صورتِ حال نے اُردو زبان میں یہ روایت قائم کر دی کہ وہ مختلف زبانوں کے الفاظ کو اپنے نظام میں داخل کرے، ان کو اپنے سانچے میں ڈھالے اور اپنے مخصوص رنگ میں رنگ کر ان کی شکلوں کو بدل دے۔ یہی وجہ ہے کہ اس برِ عظیم میں جتنے لوگ بھی باہر سے آئے اور اپنی اپنی زبانوں کو ساتھ لائے ان سب کے الفاظ اُردو زبان میں داخل ہوتے چلے گئے اور جب مغرب سے مختلف قومیں اس برِ عظیم میں تاجروں کی حیثیت سے داخل ہوئیں تو سات سمندر پار سے آئے ہوئے ان لوگوں کی زبانیں بھی کسی حد تک اُردو زبان کا جُز بننے لگیں۔ چنانچہ پُرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی زبان کے الفاظ اُردو میں اس طرح داخل ہوئے کہ اس زبان کے بولنے والوں اور اس کے علمبرداروں نے کبھی اس بات کو سوچا بھی نہیں کہ وہ کس زبان کے الفاظ ہیں۔ مثلاً "قمیض" کا لفظ ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قمیض کا لفظ ہماری مشرقی زبانوں میں سے کسی زبان کا لفظ ہے۔ لیکن درحقیقت یہ پُرتگالی ہے جس کو KAMEZ کہتے ہیں۔ یہ لفظ اُردو زبان میں آگیا اور ہم اس کو بالکل اسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح اپنی زبان کے الفاظ کو استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور لفظ "کوٹھی" ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ "کوٹھی" ہندی کا کوئی لفظ ہے اور ہماری اسی وجہ سے بہت عام ہے۔ ہر شخص ایک اچھے مکان کو کوٹھی کہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوٹھی بھی ایک پرتگالی لفظ ہے اور کوٹھی اس مکان کو کہتے تھے جس میں باہر سے آئے ہوئے پرتگالی تاجر اپنا مال بھی رکھتے تھے اور اس میں قیام بھی کرتے تھے وقت کے ساتھ ساتھ کوٹھی کا یہ لفظ ہماری اُردو زبان میں مغربی طرز کے اس مکان کے لیے استعمال

ہونے لگا جو کشادہ اور خوبصورت ہو۔ غرض اس طرح نہ صرف پرتگالی بلکہ دوسری مغربی زبانوں کے بے شمار الفاظ اُردو زبان میں داخل ہوتے چلے گئے اور کسی کو اس بات کا احساس بھی نہ ہوا کہ یہ الفاظ کس طرح ہماری زبان میں آرہے ہیں اور کیا صورت اختیار کر رہے ہیں۔ بولنے والے اور لکھنے والے اسی طرح ان کو بولتے اور لکھتے رہے جیسے یہ ان کی زبان کے الفاظ ہیں۔ برصغیر ہندوپاک کی تاریخ اس بات کو بتاتی ہے کہ پرتگالیوں کا اثر اس سرزمین پر زیادہ نہیں رہا۔ ظاہر ہے کہ ان کے مقابلے میں انگریزوں کے اثرات بہت گہرے رہے۔ کیونکہ انہوں نے اس ملک میں اپنی زندگی کا آغاز تو تاجروں کی حیثیت سے کیا لیکن بالآخر یہ لوگ یہاں کی سیاست میں حصّہ لینے لگے، یہاں تک کہ حکمران بن بیٹھے۔ اس لیے ان کا اثر ظاہر ہے کہ برعظیم ہندوپاکستان کی تہذیب وثقافت پر بہت گہرا ہوا۔ انہوں نے کئی سو سال تک اس ملک کے مختلف حصّوں پر باقاعدہ حکومت کی اور یہاں کے نظامِ تعلیم کو یہاں کی معاشرت وتہذیب کو یہاں کے فکر وفلسفے کو یہاں کے شعر وادب کو غرض نظامِ حیات کے تقریباً تمام شعبوں کو متاثر کیا اور ان کے اثرات اتنے گہرے ہوئے کہ ان کو کسی حال میں کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے لباس میں، رہن سہن میں، سوچنے اور غور کرنے کے انداز میں محسوس کرنے کے طور طریقوں میں بھی ان کے اثرات کسی نہ کسی طرح نظر آتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور اسی سے چشم پوشی کرنا درحقیقت ایک تاریخی حقیقت کو نظر انداز کرنا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اس برعظیم ہندوپاکستان کے مسلمانوں نے انگریزوں کے مقابلے میں سپر ڈال دی۔ ان کی آخری کوشش انگریزوں کو اس ملک سے باہر نکالنے کی ناکام ہوگئی۔ اس کے بعد جب تسلّط ہوا اور انگریزوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہوگئی تو ایک زمانے تک انگریزوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو شبہ کی نظر سے دیکھا اور ان پر کبھی بھی بھروسہ نہیں کیا۔ مسلمانوں نے بھی انگریزوں کے ساتھ ظاہری سطح پر تو کچھ مطابقت پیدا کرلی، کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا لیکن دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہمیشہ ایک غبار سا رہا۔ جس نے گذشتہ سو سال میں کبھی کبھی سیاسی میدان میں آندھیوں کی شکل اختیار کی۔ تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سرسیّد احمد خاں نے مسلمانوں کو اس ابتلا کے دور میں نئی راہیں دکھائیں۔ انہوں نے انگریزوں کے ساتھ مطابقت

اس لیے پیدا کی کہ ایک طرف تو وہ شبہات دُور ہوں جو انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے جاگزیں تھے اور دوسرے اس وجہ سے کہ برادرانِ وطن اس وقت سے بہت پہلے انگریزوں کے ساتھ باقاعدہ مطابقت پیدا کر چکے تھے اور زندگی کے ہر شعبے میں تیزی کے ساتھ آگے کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ سر سیّد احمد خان کی دُور بین نظروں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ مسلمان اس دوڑ میں بہت پیچھے ہیں جو اس برِ عظیم میں مختلف قوموں کے درمیان شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ سرسیّد نے قریب لانے کے لیے اپنی سی پوری کوشش کی اور بڑی حد تک اس کا اثر بھی ہوا۔ معاشرت، تہذیب، ثقافت، نظامِ فکر، عقائد ان تمام چیزوں میں اس کے اثرات نظر آتے ہیں۔ خود سرسیّد کا نظامِ فکر ان اثرات کا آئینہ ہے۔ مسلمانوں کو سرسیّد کی اس تحریک سے جو فائدے پہنچے اس کی تفصیل کو یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ حدِ نظر تک چھائی ہوئی تاریکیوں میں سرسیّد کے نظامِ فکر نے ایک مشعل کا کام کیا اور مسلمان اس مشعل کو ہاتھ میں لے کر ترقی کی راہ پر آگے کی طرف بڑھے۔ یہ اور بات ہے کہ سرسیّد کے زمانے میں کچھ لوگ مسلمانوں ہی میں ایسے موجود تھے جو کسی سطح پر انگریزوں کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان لوگوں کا اثر بھی مسلمانوں کی ثقافتی زندگی پر پڑا۔ ظاہر ہے کہ سرسیّد ان لوگوں کے مقابلے میں اپنی قوم کی نبض شناسی کا کام زیادہ بہتر طریقے پر انجام دے سکتے تھے۔ سرسیّد احمد خان نے مغرب کا اثر قبول کیا اور انگریزوں سے مطابقت پیدا کرنے کی طرف توجہ بھی دلائی لیکن یہ تصور کر لینا بہت بڑی غلطی ہے کہ سرسیّد اپنے زمانے میں انگریزوں کی تہذیب، ثقافت اور زبان و ادب سے مرعوب تھے۔ ایسا نہیں تھا۔ وہ اپنی لسانی، ادبی، معاشرتی اور تہذیبی روایات کا گہرا شعور رکھتے تھے اور یہی سبب ہے کہ ان کی تحریک میں بڑی صحت مندی نظر آتی ہے۔ اور اس کے اثرات مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں بہت گہرے اور دیرپا دکھائی دیتے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسیّد نے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس میں مغرب اور خصوصاً انگریزوں کے اثرات ہمارے نظامِ حیات پر وقت کے ساتھ ساتھ گہرے ہوتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرسیّد کے زمانے میں اور ان کے بعد بھی انگریزی کا اثر ہماری معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی پر پڑتا رہا بلکہ بعض اوقات تو یہ اثرات اس حد تک پڑے ہیں کہ ان

ہیں کہیں کہیں سطحیت کے آثار بھی دکھائی دینے لگے۔ زبان میں سطحیت سب سے زیادہ کھٹکتی ہے مثلاً خود سرسید کے ہم عصروں میں سے بعض اہم لکھنے والوں نے اپنی تحریر اور تقریر دونوں میں کہیں کہیں انگریزی کے اجنبی اور نامانوس الفاظ کو استعمال کیا۔ ان تحریروں اور تقریروں میں ایسے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جن کے متبادل الفاظ اُردو زبان میں آسانی سے مل سکتے ہیں لیکن اس وقت انگریزوں کے اثر کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ حالی اور نذیر احمد کے ایسے بڑے اور اہم لکھنے والے بھی اس سے نہ بچ سکے۔ حالی کی مختلف تحریروں میں بعض اوقات انگریزی کے ایسے الفاظ آتے ہیں جو ہمیں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔ کم و بیش یہی حال نذیر احمد کا بھی ہے لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حالی اور نذیر احمد نے شعوری طور پر انگریزی کے اجنبی اور نامانوس الفاظ استعمال نہیں کئے۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے جن کی وجہ سے وہ ایسا کرنے کے لیے مجبور ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ان الفاظ کو اُردو زبان میں کوئی ایسا مقام نہ دے سکے جو ان کے شایانِ شان ہو۔

سرسیّد احمد خان اور ان کے بعد کا دور، خاص طور پر بیسویں صدی کا زمانہ، اُردو زبان اور ادب کی ترقی کا زمانہ ہے اور اس زمانے میں اس زبان اور ادب نے اپنے دامن میں بہت سی وسعتیں پیدا کیں۔ یہی زمانہ ہے جب مغرب کے اثر سے اس برصغیر کی زندگی میں ایک انقلابی تبدیلی رونما ہوئی۔ صنعتیں قائم ہوئیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کام ہوا اور اس طرح زندگی اپنے محدود دائرے میں رہ کر ان رُکاوٹوں کے باوجود، جو انگریزوں نے پیدا کر رکھی تھیں آگے کی طرف بڑھی۔ اس صورتِ حال نے زبان کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ جو چیزیں اس انقلابی تبدیلی کے زیرِ اثر برعظیم میں آئیں۔ ان کے لیے انگریزی کے الفاظ اس طرح فطری انداز میں داخل ہوئے کہ ان کے اجنبی اور نامانوس ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ریل کا نظام شروع ہوا تو ریل، ریلوے لائن، اسٹیشن، سگنل، سٹیشن ماسٹر، ٹکٹ کلکٹر، فورمین، چارج مین، انجن، گارڈ، ٹکٹ چیکر، پلیٹ فارم اور اس طرح کے بے شمار انگریزی الفاظ اُردو زبان میں داخل ہوگئے اور کسی کو اس بات کا احساس نہ ہوا کہ ان الفاظ کے متبادل کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ تقریباً ایک صدی سے یہ الفاظ اُردو زبان میں رائج ہیں اور اب اس زبان کے مزاج کا جز بن چکے

ہیں۔ ان کو اس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کی روشنی اس برعظیم میں بھی پھیلنے لگی۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہ ترقی بڑی حد تک محدود تھی اور انگریزوں نے اپنے مفاد کے پیش نظر اس کو محدود کر رکھا تھا اس لیے کہ وہ اس برعظیم کے لوگوں کو اس میدان میں آگے بڑھنے دینا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن زندگی کے قانون کو کوئی بدل نہیں سکتا تھا۔ ترقی کی رفتار محدود ہو سکتی ہے۔ اسے ایک خاص وقت تک روکا جا سکتا ہے لیکن اس کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ ہوا کہ سائنس کے مختلف شعبے جب اس برعظیم پر اپنا جادو جگانے لگے تو بے شمار الفاظ ایسے اس زبان میں داخل ہوئے جن کی اصل تو انگریزی یا کوئی اور مغربی زبان تھی لیکن بدلتے ہوئے حالات میں استعمال ہونے کی وجہ سے وقت کے ساتھ ساتھ اس زبان کے مزاج کا جزو بن گئے۔ مثلاً ہسپتال، ڈاکٹر، نرس، تھرمامیٹر، ایکس رے، انجینئر، مشین، ٹیلیفون، ٹیلگراف، ٹیلگرام، لیبورٹری، بیکر، میٹر، لیمپ، لالٹین، اس طرح کے بے شمار الفاظ اُردو زبان میں آئے اور اگرچہ ان میں سے بعض کے اُردو ترجمے بھی بعض لوگوں نے کئے اور وہ ترجمے رائج بھی ہو گئے لیکن انگریزی کے یہ الفاظ اس زبان میں اس طرح استعمال ہوتے رہے جیسے یہ اسی زبان کے الفاظ ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں انگریزی کے جو مختلف الفاظ اس طرح آتے ہیں، اس کی یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ برسوں سے اس قسم کے الفاظ ہماری زبان میں استعمال ہو رہے ہیں، اور ان الفاظ کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ انسانی زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کے ارتقاء میں ایک فطری آہنگ موجود ہے۔ انسان کی کوششیں اور کاوشیں اس کے رُخ کو کسی حد تک بدل تو سکتی ہیں۔ لیکن اس کے راستے کو روک نہیں سکتیں۔ یہی صورت حال اُردو زبان کے ارتقاء میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ تبدیلیاں جن کا ابھی ذکر ہوا دراصل بالکل فطری انداز میں ہماری زبان میں پیدا ہوئیں اور اس لیے ان میں ہمیں اجنبیت اور نامانوسیت کا احساس نہیں ہوتا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب اس طرح کا ماحول پیدا ہوتا ہے تو بعض لوگ ان اثرات کو

اپنی زندگی میں اس طرح مسلط کر لیتے ہیں کہ ان کی صورت کسی حد تک مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ ہماری قوم کے افراد گذشتہ سو سال میں اس صورت حال سے بھی دوچار ہوئے۔ چنانچہ انگریزوں کے اثر سے بعض اوقات ہمارے لباس، رہن سہن، انداز گفتگو اور لب و لہجہ کی جو کیفیت پیدا ہوئی ہے وہ بڑی حد تک مضحکہ خیز ہے۔ آج بھی جب کہ ہم ایک آزاد مملکت کے آزاد شہری ہیں۔ آج بھی جب ہم اپنی تہذیب و ثقافت کے جگر لخت لخت کو جمع کر رہے ہیں۔ آج بھی جب ہم اپنی تہذیب کے لیے تالیفِ نسخہ ہائے وفا کرنے میں مصروف ہیں ہمارے ہاں ایسے افراد بھی مل جائیں گے جو نہ صرف اپنی زبان، تحریر و تقریر میں انگریزی زبان کے نامانوس اور اجنبی الفاظ استعمال کرتے ہیں بلکہ ان کا لب و لہجہ اور طرز گفتگو بھی ایسا ہے جس میں انگریزی لب و لہجہ اور طرز گفتگو کی جھلک نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جن کو تہذیبی اور ثقافتی روایت میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ زبان بھی ان کے اس انداز سے متاثر نہیں ہو سکتی۔ ایسے افراد کے عمل میں چونکہ سطحیت ہوتی ہے اس لیے لسانی، معاشرتی اور تہذیبی روایات پر وہ کوئی خاص اثر نہیں چھوڑتے۔ دراصل ان کا عمل نقالی کا عمل ہوتا ہے۔ وہ فیشن کے حلقہ بگوش ہوتے ہیں۔ ان کی بنیادی تہذیبی اور ثقافتی روایات پر استوار نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عمل میں یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ وہ فیشن کے طور پر بعض ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو ہماری تہذیبی اور ثقافتی روایات کے پس منظر میں عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے۔

یہ صورت حال جس کا اوپر ذکر ہوا، کہیں کہیں ادب اور تنقید میں بھی نظر آتی ہے۔ ہمارے ادب اور تنقید پر گذشتہ نصف صدی میں ایسے دور بھی گزرے ہیں جو نہ صرف انگریزی کے اجنبی اور نامانوس الفاظ بلکہ بڑے بڑے جملے اور اقتباسات بھی ہمارے لکھنے والوں نے اس طرح اپنی تحریروں کے درمیان کھپائے ہیں کہ ان کو دیکھ کر ہمارا احساس جمال تلملا اٹھتا ہے۔ انگریزی کی ادبی اور تنقیدی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ایک زمانے میں ہمارے لکھنے والے انگریزی سے اتنے مرعوب تھے کہ انگریزی کے خیالات اور انگریزی کی جمالیاتی اقدار تک کو معیار سمجھ کر اپنے ادب اور تنقید میں استعمال کرتے رہے۔

ظاہر ہے کہ زبان اس صورت حال سے بچ نہیں سکتی۔ چنانچہ اس [illegible] صورت حال کا اثر ہوا اور ہماری ادبی اور تنقیدی تحریروں میں انگریزی کے بے شمار الفاظ، فقرے [illegible] پیراگراف نظر آنے لگے۔ لیکن اردو زبان کے لسانی اور ادبی نظام نے اس کو قبول نہیں کیا۔ چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ سب اپنی موت آپ مر گئے۔ البتہ اُردو زبان میں ادب، تنقید اور جمالیات کی بعض اصطلاحات ایسی ضرور استعمال ہونے لگیں جن کی متبادل اصطلاحات اس میں موجود تو تھیں لیکن جن کے ساتھ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو وابستگی نہیں تھی۔ ان کے مقابلے میں انگریزی کی اصطلاحات ان کے لیے نسبتاً زیادہ مانوس تھیں مثلاً ایمیجری کی تنقیدی اصطلاح اُردو میں استعمال ہونے لگی۔ حالانکہ اس کا ترجمہ تصویر کاری اور پیکر تراشی بھی ہو سکتا تھا۔ بعض نقادوں نے ان دونوں اصطلاحوں کو استعمال کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ایمیجری کا صحیح مفہوم ان الفاظ سے واضح نہ ہو سکا۔ اس قبیل کے کچھ اور الفاظ بھی مل جائیں گے جن کو ہمارے ادیبوں اور نقادوں نے استعمال کیا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بے شمار ادبی تنقیدی اور جمالیاتی اصطلاحات کے اُردو مترادفات بھی ہمارے لکھنے والوں نے استعمال کرنے شروع کئے۔ اور یہ سب آج اُردو زبان کا سرمایہ ہیں۔

علمی اصطلاحات کا مسئلہ بھی اس سلسلے میں خاص طور پر سامنے رکھنے کے قابل ہے۔ کسی ترقی پذیر زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ سب سے زیادہ توجہ کا طالب ہوتا ہے اردو میں بھی ایسا ہی ہوا اور اس زبان کو بھی اس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔ جب علوم نے ترقی کی اور ان میں تدریس اور تحقیق کا کام علمی اور تحقیقی اداروں میں شروع ہوا تو علمی اصطلاحات کی ضرورت پیش آئی۔ ترجمے کے لیے اُردو والوں نے فارسی اور عربی کی طرف رجوع کیا اور ان کو سامنے رکھ کر علمی اصطلاحات کے بے شمار ترجمے کر ڈالے لیکن ان میں سے بہت کم عام ہوئے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہماری زندگی میں تقریباً ایک صدی کا زمانہ اب گزرا جب ہمارے نوجوان عربی اور فارسی کے مقابلے میں انگریزی کی روایت سے نسبتاً زیادہ قریب ہیں۔ اس لیے انگریزی کی اصطلاحات ان کے لیے زیادہ نامانوس اور اجنبی نہیں ہیں اگر یہ صحیح استعمال

نہ ہوتی تو جامعہ عثمانیہ میں مختلف علمی اصطلاحات کے جو اُردو ترجمے ہوئے تھے وہ سب عام ہوگئے ہوتے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آج بھی علوم کی دنیا میں انگریزی کی علمی اصطلاحات ہمارے نوجوان زیادہ آسانی سے استعمال کرتے ہیں۔ اور اصطلاحات کے مسئلے کا بہتر حل شاید یہی ہے کہ ہم ان تمام انگریزی کی علمی اصطلاحات کو اپنی زبان میں داخل کرلیں جو آج ہمارے لیے اجنبی اور نامانوس نہیں ہیں اور جن سے ہمیں آئے دن واسطہ پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں وقت لگے گا۔ ہوسکتا ہے ان میں سے بعض اصطلاحات جو رائج کی جائیں وہ ہماری زبان کا ساتھ نہ دے سکیں اور ان کے ترجمے عام ہو جائیں۔ لیکن بہرصورت اس کا تجربہ کرنا چاہیئے۔

آجکل انگریزی کے الفاظ کا استعمال ہماری زبان میں بھونڈے طریقے پر بھی ہو رہا ہے۔ اس میں ادبی زبان تحریر و تقریر اور عام گفتگو سبھی کچھ شامل ہے۔ دراصل انگریزی ہمارے مزاجوں میں اس حد تک داخل ہو چکی ہے کہ ہم بغیر کوشش کے غیر شعوری طور پر بعض ایسے الفاظ روانی کے ساتھ استعمال کرتے چلے جاتے ہیں جن کا استعمال، اگر غور کیا جائے تو خود استعمال کرنے والوں کو ا[illegible] معلوم ہوگا۔ اس کے لیے ان لوگوں کو مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا جو ایسا کرتے [illegible]یزی کی چھاپ ہمارے نظامِ حیات پر بڑی گہری ہے لیکن اس صورتحال کو بڑی حد تک ختم کیا جاسکتا ہے اور وہ اس طرح کہ ان لوگوں کو زبان کی اہمیت اور اس کے مزاج کی کیفیت کا احساس دلایا جائے۔ یہ کام ایک منصوبے کے تحت جب تک نہیں ہوگا خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوسکتے۔ اس لیے سب سے پہلے نظامِ تعلیم کے ابتدائی مدارج کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے بلکہ اس سے بھی پہلے گھروں کے ماحول کو درست کرنا لازمی ہے جب تک بچے کو یہ احساس نہ دلایا جائے گا کہ زبان اپنا ایک نظام رکھتی ہے اور وہ دوسری زبانوں کے الفاظ کے بے جا اور بے محل استعمال کو برداشت نہیں کرسکتی، اس وقت تک اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی کامیابی نہیں ہوسکتی۔ مشکل تو یہی ہے کہ اس وقت ہمارے گھروں میں اس بات کا شعور نہیں ہے۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بچے بڑھ کر جب جوان ہوتے ہیں تو ان ک

تحریر و تقریر میں انگریزی الفاظ کی خاصی فراوانی نظر آتی ہے اور انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کوئی ایسی بات کر رہے ہیں جو ان کی لسانی اور تہذیبی روایت کے خلاف ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ زبان کا ارتقا فطری ہوتا ہے لیکن انسان کی کوششیں اور کاوشیں اس ارتقائی کیفیت میں زندگی، حرکت، حسن اور نکھار تو پیدا کر سکتی ہے۔

اُردو زبان آج اسی کوشش اور کاوش کے عمل کے لیے چشم براہ ہے۔

اُردو زبان کی موجودہ صورتِ حال

اُردو زبان کی موجودہ صورت حال کا موضوع درحقیقت اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اُردو زبان کی اہمیت، اس کی مختصر تاریخ، اس کی ثقافتی اور تہذیبی کیفیت، برعظیم ہندو پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ اس کا تعلق، قیام پاکستان میں اس کی نمایاں حیثیت اور پاکستان میں اس کے موجودہ مسائل پر غور کیا جائے۔

اردو زبان برعظیم ہندو پاکستان میں مسلمانوں کی آمد کے باعث وجود میں آئی۔ یہاں اس وقت مقامی بولیاں تھیں، مسلمان مختلف علاقوں میں داخل ہوئے۔ کہیں تاجروں کی حیثیت سے کہیں حملہ آوروں کی حیثیت سے اور اس برعظیم کے مختلف علاقوں میں انہوں نے اپنا اثر قائم کیا اور حکمرانی کی۔ جنوبی ہندوستان میں عرب تاجروں کی حیثیت سے آئے۔ سندھ میں محمد بن قاسم کا حملہ ہوا۔ شمالی مغربی سرحد سے غزنوی اور غوری اس سرزمین میں داخل ہوئے۔ اس طرح برعظیم کے علاقے میں مسلمانوں کا اثر مستقل صورت اختیار کرتا گیا۔ سیاست، تاریخ، تہذیب معاشرت متاثر ہوئی۔ زبان پر بھی اثر ہوا۔ مقامی بولیوں سے جب عربی اور فارسی زبانیں ملیں تو اُردو کی بنیاد پڑی اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ زبان مستقل صورت اختیار کر گئی۔

مغلوں کے دور آخر میں اس زبان میں ادب کی تخلیق باقاعدگی سے شروع ہوگئی اور شعر و شاعری اور نثر کا آغاز ہوا۔ اُردو زبان درحقیقت مسلمانوں کے تہذیبی مزاج کی نمائندگی کرتی تھی اور برعظیم کے ہر علاقے میں مسلمان اس میں تخلیقی کام کرتے رہے۔ چنانچہ بڑے بڑے

ادیب اور شاعر اس زبان میں پیدا ہوئے۔

ہندوؤں کی جو تحریکیں قدیم ہندو تہذیب کو پروان چڑھانے کے لیے شروع ہوئیں انہوں نے اس زبان کی خاص طور پر مخالفت کی اور سنسکرت الفاظ سے بوجھل ایک زبان جدید ہندی کے نام سے بنانے کی کوشش کی، جس میں پراچین بھارت کا رنگ نمایاں تھا۔ آریہ سماج کی تحریک اس میں پیش پیش تھی۔ پنجاب میں خاص طور پر انہوں نے اُردو کی مخالفت میں کام کیا اور ہندوؤں کو ہندی کو اپنانے کا احساس دلایا۔ قیام پاکستان کی تحریک مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن حاصل کرنے کی تحریک تھی جس میں اپنی تہذیب کو پروان چڑھانے کا موقع ملے۔ اُردو زبان اس تہذیب کی علامت تھی۔ اس لیے قیام پاکستان کی تحریک میں اس زبان کو بنیادی اہمیت حاصل رہی۔ قائد اعظم کی مادری زبان اردو نہیں تھی لیکن انہوں نے اُردو سیکھی اور قیام پاکستان سے چند سال قبل وہ اُردو میں تقریریں فرماتے۔ اس خیال سے کہ مسلمانوں کو اُردو کی اہمیت کا احساس ہو۔

قیام پاکستان کے بعد قائد اعظم نے واضح طور پر اس خیال کا اظہار کیا کہ اس نئی اسلامی مملکت کی زبان اُردو ہوگی۔ چنانچہ جب مشرقی بنگال میں اس کی مخالفت ہوئی تو وہ خود وہاں تشریف لے گئے اور واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی جن لوگوں نے قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے میں اُردو کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کے لیے کام کیا ان میں خواجہ ناظم الدین مرحوم، فضل الرحمٰن مرحوم وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ انہوں نے بنگالی ہوتے ہوئے بھی اُردو کی حمایت کی تاکہ پاکستانی قومیت کی بنیادیں مضبوط ہو سکیں۔ لیکن حالات نے ایسی صورت اختیار کی کہ ایک منزل وہ آئی جب بنگلہ کو بھی ایک دوسری قومی زبان بنایا گیا۔ یہ پاکستانی قومیت کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس کے نتائج بہت بعد میں ظاہر ہوتے اور اب تو وہ بہت ہی واضح ہو چکے ہیں۔ پاکستان کے ایک حصّے کا اُس سے جُدا ہونا در حقیقت اسی کا نتیجہ تھا۔

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ موجودہ دور میں اُردو زبان کے لیے پاکستان میں کام نہیں ہوا۔

اصولی طور پر پاکستان کی تمام حکومتوں نے اُردو کو قومی زبان تسلیم کیا اور موجودہ حکومت نے تو آئین میں واضح طور پر یہ بات درج کی ہے کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ اس لیے اصولی طور پر اردو زبان کی اہمیت پاکستان میں محفوظ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض علمی دشواریوں کی وجہ سے ابھی سرکاری اور دفتری سطح پر ایسا کام نہیں ہو رہا ہے جس سے یہ زبان باقاعدہ دفتری اور سرکاری زبان کی حیثیت اختیار کرے۔

مرکز اور صوبوں دونوں میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اردو چونکہ قومی زبان ہے اس لیے اس میں سرکاری کام ہونا چاہیئے۔ بلوچستان، صوبہ سرحد اور سندھ نے بھی اس کا باقاعدہ اعلان کیا ہے اور پنجاب میں ظاہر ہے کہ یہ زبان سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور پنجاب نے ہمیشہ اس کو اپنی زبان سمجھا ہے چنانچہ حکومت پنجاب نے صوبائی سطح پر ایک کمیٹی قائم کی ہے جس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جلد از جلد دفتر کا سارا کام اُردو میں ہوگا۔ اس کمیٹی کے فیصلے کے نتائج میں سٹینوگرافروں اور ٹائپسٹوں کو تیار کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ سینکڑوں کی تعداد میں اب تک تیار کیے جا چکے ہیں۔ ٹائپ رائٹر خریدنے کے لیے حکومت نے احکامات دے دیے ہیں۔ ضلع اور تحصیل کے دفتروں میں بھی ہدایات بھیجی گئی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ کام اردو میں ہو اور ٹائپسٹ اور مشینوں کے نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو عملی شکل دینے میں تاخیر نہ کی جائے۔ چنانچہ پنجاب میں تیزی سے یہ کام ہو رہا ہے۔ پنجاب پاکستان کا دل ہے اور اگر پنجاب میں یہ زبان دفتری سطح پر رائج ہوتی ہے تو مرکز اور دوسرے صوبوں کے لیے ایک مثال قائم ہوگی۔

موجودہ دور میں اُردو زبان کا دائرہ پاکستان کے باہر بھی وسیع ہوا ہے۔ ہندوستان نے اس زبان کے ساتھ دشمنی کی کیونکہ یہ مسلمانوں کی زبان تھی اور اس پر مسلم تہذیب کی چھاپ تھی لیکن وہاں بھی وقت نے یہ ثابت کیا کہ اس زبان کے بغیر کام نہیں چل سکتا چنانچہ فلمیں اس زبان میں بنائی جا رہی ہیں اور سُنا یہ ہے کہ اُردو کو ادھر چند سال سے حکومت نے ایک زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے۔ پھر انگلستان اور عرب ممالک میں بے شمار پاکستانی اس وقت کام کر رہے ہیں۔ وہاں بھی یہ زبان وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط ہو رہی ہے۔ اس میں اخبارات

اور رسائل شائع ہو رہے ہیں اور بولنے کی زبان کی حیثیت سے بھی اس کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔
اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ انگلستان، امریکہ، روس، جرمنی، اٹلی، فرانس، ایران اور ترکی کی یونیورسٹیوں میں اُردو کی تعلیم کا باقاعدہ چرچا ہے کیونکہ اس کو پاکستان کی قومی زبان کا درجہ حاصل ہے اور پاکستان کے باہر بھی یہ احساس ہے کہ یہ زبان ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اُردو زبان کی ترقی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہمیشہ پیش آتی رہی ہیں۔ سب سے پہلے فارسی سے اس کا مقابلہ ہوا، پھر جدید ہندی اس کے مقابلے میں آگئی اور اس کے بعد انگریزی نے اس کا راستہ روکا لیکن گذشتہ دو سو سال میں وہ برابر ترقی کرتی رہی۔ ریاست حیدرآباد اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اس کو تعلیمی اور سرکاری زبان بنانے کا تجربہ کیا گیا۔ پاکستان میں بھی جزوی طور پر اس پر عمل ہوا اس لیے اس زبان کا مستقبل روشن ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ زیادہ ترقی کرے گی کیونکہ یہ ایک بہت بڑی اسلامی مملکت کی قومی زبان ہے۔

تخلیقی عمل کا المیہ

اُردو ادب کی موجودہ صورتِ حال

پاکستانی ادب

تخلیقی عمل کا المیہ

قیام پاکستان تاریخ کا ایک نہایت ہی اہم واقعہ تھا۔ اس واقعے نے نہ صرف برعظیم ہند و پاکستان کے سیاسی نقشے کو بدلا بلکہ دنیا کے سیاسی نقشے میں بھی تبدیلیاں پیدا کیں۔ گذشتہ پچیس سال کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ پاکستان نے حد درجہ ناساز گار حالات کے باوجود نہ صرف اپنے وجود کی اہمیت کو تسلیم کرایا بلکہ سیاستِ عالم کے دھاروں کے رُخ بھی موڑے، اور اس طرح بہت تھوڑے عرصے میں پاکستان نے عالمی سیاست کی بساط پر ایک اہم اور منفرد حیثیت اختیار کر لی۔ ملکوں اور مملکتوں کا قیام آسانی سے عمل میں نہیں آتا اور اس طرح دنیا کی سیاست میں ایک منفرد حیثیت اختیار کر لینا آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے کسی قوم کی پوری سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور ذہنی و فکری تاریخ ہوتی ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ اسی تاریخ اور تاریخی شعور ہی کی وجہ سے کوئی قوم اقوام عالم میں اپنا مقام پیدا کرتی ہے۔ قیام پاکستان کے پیچھے بھی اسی تاریخ اور تاریخی شعور کا ہاتھ تھا۔ برعظیم ہند و پاکستان میں مسلمانوں کی کئی سو سال کی تاریخ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تہذیب نے پاکستان کی تحریک کو پیدا کیا اور اس کو آگے بڑھایا۔ چنانچہ قیام پاکستان نہ صرف برعظیم ہند و پاکستان کے مسلمانوں بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک اہم سیاسی اور تاریخی واقعہ ثابت ہوا۔

قیام پاکستان کے وقت پوری مسلمان قوم میں زندگی کی ایک لہر دوڑی ہوئی تھی اور اس قوم کا ہر فرد ایک خاص جذبے سے سرشار تھا۔ یہی سبب ہے کہ ناسازگار حالات کے باوجود

پاکستان نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں طور پر ترقی کی اور گذشتہ ربع صدی میں زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں طور پر ترقی کی اور گذشتہ ربع صدی میں زندگی کے ہر شعبے کو آگے بڑھایا۔ ان علاقوں میں، جہاں آزادی سے قبل انگریزوں کے عہد حکومت میں کوئی صنعتی ترقی نہیں ہوئی تھی، قیام پاکستان کے بعد صنعتی اعتبار سے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کی گئیں اور اس کے نتیجے میں زندگی کے دوسرے شعبے بھی ترقی کے راستے پر گامزن ہوئے۔ محدود وسائل کے باوجود پاکستان کی یہ ترقی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کے یہ مختلف کارہائے نمایاں تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں اس ترقی کے ساتھ ساتھ پاکستانی قومیت کا جیسا شعور ہمارے ہاں پیدا ہونا چاہیئے تھا، وہ پیدا نہ ہو سکا۔ برخلاف اس کے ہوا یہ کہ صنعتی اور مادّی ترقی کے خیال نے اور اس پر ایک خاص طبقے کی حکمرانی نے زندگی میں مادیت پرستی کے رجحان کو عام کیا۔ چنانچہ طبقاتی تفریق شدت کے ساتھ نمایاں ہوئی اور لوٹ کھسوٹ کا ماحول پیدا ہو گیا۔ سرمایہ دار اور صنعت کار اتنے امیر ہو گئے کہ ان کے لیے دولت کا سنبھالنا مشکل ہو گیا لیکن غریب محنت کش غریب سے غریب تر ہوتا گیا۔ کیونکہ طبقاتی نظام نے اس کو پامال کر کے رکھ دیا اور اس کی آواز بُری طرح دبا دی گئی۔ ہمارے یہاں قیام پاکستان کے بعد پاکستانی قومیت کے شعور میں جو تنزل پیدا ہوا اس کی بنیادی وجہ بھی یہی طبقاتی تفریق تھی اور اسی وجہ سے پاکستان کے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ گذشتہ پچیس سال میں پاکستان نے سیاست کی دنیا میں جو تماشے دیکھے ہیں وہ سب اسی طبقاتی تفریق کے ہاتھوں پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس صورتِ حال کے نتیجے میں ہمارا وجود نک میں پڑ گیا۔ ہم خود اپنے اعمال سے اپنے وجود کی نفی کرنے پر تلے رہے اور بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمیں اس کا احساس تک نہ ہُوا۔

یہ ایک بڑی ہی المناک داستان ہے۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا تھا۔ اسلام اور اس کے فکری نظام کو اس میں بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ ہم نے اپنی سیاسی تحریک کی بنیاد اسی فکری نظام پر رکھی تھی اور یہ فکری نظام برعظیم

ہندوپاکستان میں صدیوں سے مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا رہا تھا۔ شاہ ولی اللہؒ مولانا اسماعیل شہیدؒ، مولانا سید احمد بریلویؒ، سر سید احمد خاں، علامہ اقبالؒ، یہ سب اس برعظیم میں اسلام کی ذہنی اور فکری تحریکوں کے علم بردار تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے زمانے میں برعظیم ہندوپاکستان کے مسلمانوں کے فکروعمل کی آبیاری کی تھی۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ برعظیم ہندوپاکستان میں ہندوؤں نے کبھی مسلمانوں کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ انہوں نے مختلف طریقوں سے ان کی جڑوں کو کاٹنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ نقصان جو مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے پہنچا۔ وہ معاشی اور اقتصادی تھا۔ ہندوؤں نے مغلوں کی سلطنت کے ختم ہونے کے وقت ہی سے یہاں کی معیشت کو اپنے قبضے میں کیا اور ایسے منصوبے بنائے جن کی وجہ سے اس برعظیم میں مسلمان ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے۔ ہندوؤں کا سرمایہ دار طبقہ معیشت پر حاوی ہوگیا اور مسلمان اقتصادی اعتبار سے اس سرمایہ دار طبقے کے دست نگر ہو کر رہ گئے۔ انگریزوں نے اپنے مقصد سے ایک جاگیردارانہ نظام قائم کیا۔ اس میں چند مٹھی بھر مسلمان ضرور شریک ہو کر بظاہر ضرور خوشحال نظر آنے لگے لیکن مسلمانوں کی اکثریت انگریزوں اور ہندوؤں کے معاشی اور اقتصادی استحصال کا شکار ہوگئی۔

پاکستان کی تحریک میں اس صورت حال نے بھی بڑا کام کیا۔ وہ مسلمان جو اس استحصال کا شکار تھے، انہوں نے پاکستان کے قیام میں اس خیال سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کہ اس طرح ہندو اور انگریز کا استحصال ختم ہو جائے گا اور وہ ایک آزاد وطن میں اپنے آپ کو معاشی اور اقتصادی اعتبار سے بھی آزاد محسوس کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے لیے بے شمار قربانیاں دیں اور بالآخر اپنی کوششوں سے ایک ملک کی تعمیر و تشکیل کی۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے فوراً بعد یہاں بھی ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے ساری معیشت کو اپنے ہاتھ میں لے کر عوام کو کہیں کا نہ رکھا چنانچہ ان کی معاشی اور اقتصادی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوسکی۔ یہاں کی ساری صنعتیں، سارا کاروبار اس طبقے کے افراد کے مفادات تک محدود ہو کر رہ گیا اور اس طبقے نے ایسے عجیب و غریب رویے اختیار کئے کہ ان کی وجہ سے ہماری

ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سارا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ کھوکھلی نعرہ بازی نے ہماری زندگی کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ اس طبقے میں منافقت و دورنگی عام ہوئی اور یہ زہر سارے معاشرے میں پھیلا۔ چنانچہ یوں محسوس ہوا جیسے یہ ہماری قوم کا مزاج بن گیا ہے۔ ہر شخص کے دو چہرے نظر آنے لگے۔ ایک کو اس لے پردے کے پیچھے چھپائے رکھا اور دوسرے کو دکھایا۔ مثلاً لوگوں نے اسلام کا نعرہ لگایا اور اسلامی نظام کی بات کی لیکن اسلام اور اسلامی نظام کی عملی صورتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ بلکہ اپنے قول اور عمل سے معاشرے کے بیشتر افراد اسلامی اقدار کی نفی کرتے رہے۔ یہاں تک ہوا کہ ان لوگوں نے اسلام کے نام کو اپنے مادّی مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ کسی پر الزام لگانے یا کسی کو تکلیف پہنچانے کے لیے بھی ایسے لوگوں نے اسلام کو استعمال کیا جن کو خود اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ چنانچہ معاشرے میں ایک عجیب و غریب صورت حال پیدا ہوئی۔ قول و فعل میں ایک عجیب طرح کا تضاد نمایاں ہونے لگا۔ اس طرح زندگی کے ہر شعبے میں ایک کھوکھلے پن کی کیفیت پیدا ہوئی جس سے معاشرے کی بنیادیں ہل گئیں۔

ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں زندگی کی کوئی مثبت قدر پروان نہیں چڑھ سکتی۔ اجتماعی احساس و شعور ناپید ہو جاتا ہے۔ زندگی کی اعلیٰ اور ارفع قدروں کا تصور تک باقی نہیں رہتا۔ زاویۂ نظر انفرادی اور مادی ہو جاتا ہے۔ نظامِ اخلاق بگڑ جاتا ہے۔ انسانی ہمدردی نام کو باقی نہیں رہتی۔ دوسروں کی تکلیفوں کا احساس ہٹ جاتا ہے۔ دولت کو جمع کرنا اور اپنے طبقے کو مادّی اعتبار سے بلند کرنا ہی زندگی کا معیار تصور کر لیا جاتا ہے۔ لذّت پرستی اور تعیش پسندی زندگی کا معیار بن جاتی ہے۔ ذاتی مفاد کے لیے الزام تراشی عام ہو جاتی ہے۔ ذہنوں کے دریچے بند ہو جاتے ہیں اور افکار تازہ کی ہوائیں ان دریچوں سے سر تو ٹکراتی ہیں لیکن ان کا داخلہ وہاں مسدود ہی رہتا ہے۔

اب ہمارے معاشرے میں اس صورت حال کو سب ہی نے محسوس کرنا شروع کر دیا۔ ایک مخصوص طبقے نے پاکستان کو جس طرح نئے خیالات اور مثبت اقدار کے تصورات سے محروم رکھا اس کی حقیقت اب سب پر واضح ہو گئی ہے لیکن ابھی تک اس کے

خلافت جیسی مثبت تحریک پیدا ہونی چاہیے تھی وہ پیدا نہیں ہو سکی ہے، البتہ اس کے لیے زمین ضرور ہموار ہو چکی ہے۔ انقلاب انہی حالات میں پرورش پاتا ہے۔ مشہور فرانسیسی مصنف رومیں رولاں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب انقلاب آتا ہے تو اس کے قدموں کی آہٹ سنائی نہیں دیتی۔ اس لیے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر پاکستان میں اب تک کوئی انقلابی تحریک وجود میں نہیں آسکی تو آئندہ بھی نہیں آئے گی۔ ہماری اجتماعی زندگی کا جو انداز رہا ہے اس نے یقیناً تحریکوں کو پنپنے نہیں دیا، لیکن افراد کے دلوں میں یہ تحریکیں ضرور موجزن ہوتی رہیں۔ جب بھی ان تحریکوں کو عملی شکل دینے کے آثار افراد میں نظر آئے تو ایک خاص طبقے نے ہمیشہ ان کا گلا گھونٹ دیا اور ظاہر یہ کیا کہ ملک اور قوم کے مفاد کے پیش نظر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اس ملک میں سیاست کا گلا گھونٹا گیا۔ انسان دوستی کی جو تحریکیں تھیں ان کو جرم قرار دیا گیا۔ پامال طبقے کے مسائل کی طرف کبھی کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اگر کبھی یہ آواز سُنی بھی گئی تو اس کو کفر و الحاد سے تعبیر کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں گھٹن پیدا ہوئی۔ احساس شکست عام ہوا۔ غریب طبقے کے افراد زندگی سے بیزار ہونے لگے اور ان کے اندر ولولہ اور حوصلہ باقی نہ رہا۔ چنانچہ زندگی کے ہر شعبے میں تاریکی اور خاموشی نظر آنے لگی۔ بورژوا طبقے کا عوام دشمن رویہ ہمیشہ اسی صورت حال کو پیدا کرتا ہے۔ اور اس کے تمام ہتھکنڈے اسی مقصد کے لیے ہوتے ہیں۔ پاکستان میں بھی بورژوا طبقے نے عوامی تحریکوں کا اسی طرح گلا گھونٹا اور اسے یہیں اس کو بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں یہ صورت حال ہو۔ وہاں افراد کا رویّہ متوازی نہیں رہتا۔ کوئی مثبت جاندار عوامی تحریک نہ ہونے کی وجہ سے ہر شخص اپنے خول میں چلا جاتا ہے اور زندگی کے ساتھ اس کا تعلق جس طرح ہونا چاہیے باقی نہیں رہتا۔ شعوری اور غیر شعوری طور پر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ جن مثبت قدروں کا علم بردار ہے اس کی معاشرے میں کوئی جگہ نہیں۔ پھر اس کے علاوہ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ جن مثبت قدروں کو وہ عام کرنا چاہتا ہے ان قدروں کی پذیرائی اس طبقے کے افراد میں کوئی معنی نہیں رکھتی جو اس نظام کو چلا رہا ہے۔ اخلاص

اور صداقت کا اُسے فقدان نظر آتا ہے۔ اور ہر چیز بورژوا طبقے کی چالوں کے باعث اس کو اُلٹی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو تحریک زندگی میں ہونی چاہیئے تھی وہ ہمارے معاشرے میں باقی نہیں رہی اور اس صورت حال نے نہ صرف سیاست بلکہ معاشرت، تہذیب اور تخلیقی عمل میں بھی ایک جمود کو پیدا کر دیا۔ نئے خیالات پر اس طبقے نے، جو برسر اقتدار تھا، پہرے بٹھا دیے۔

مثلاً ادب میں آج سے تقریباً تیس پینتیس سال قبل ایک تحریک ترقی پسند تحریک کے نام سے شروع ہوئی تھی اور اس نے ادب اور تخلیقی عمل کی دنیا میں بڑے اہم کارنامے انجام دیے تھے۔ اس نے انسانی قدروں کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ پامال مخلوق کو اٹھانے کے نغمے گائے تھے۔ طبقاتی تفریق کا پردہ چاک کیا تھا۔ معاشرے کے گھناؤنے پہلوؤں کو سامنے لاکر دکھایا تھا۔ دولت کی مساوی تقسیم کے خیال کو عام کرنے کی کوشش کی تھی۔ انسان کو عظیم بنا کر پیش کیا تھا اور اس کی برتری اور بڑائی کے گیت گائے تھے۔ لیکن ہمارے معاشرے نے اس تحریک کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ایسے لکھنے والے، جو ان خیالات کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنا رہے تھے، کافر اور ملحد قرار دیا۔ اُن پر وطن دشمنی کے الزام لگائے، چنانچہ ان کو طرح طرح سے ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ بعض لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر اس کو طرح طرح سے بدنام کرنے کی کوشش کی۔ صفحے کے صفحے ان کے خلاف سیاہ کئے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرح کا خوف اور ڈر نہ صرف ترقی پسند اور انسان دوست ادیبوں کے دلوں میں پیدا ہو گیا بلکہ ہر ادیب اور شاعر نے غیر شعوری طور پر یہ محسوس کیا کہ وہ ایک ایسے ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے جس میں فکر و خیال اور اس کے اظہار کی آزادی نہیں ہے اور جس ماحول میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس میں وہ کسی وقت بھی گردن زدنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ غرض صحت [illegible] کی تخلیق کے لیے آزادی اور محبت کی جو فضا درکار ہے وہ ہمارے معاشرے سے رخصت ہو گئی اور ادیب اس معاشرے کے لیے اجنبی ہو گیا۔

گذشتہ پچیس سال میں پاکستانی معاشرے میں یہی گھٹن کی فضا عام رہی اور خوف کا احساس ذہنوں پر مسلط رہا۔ یہاں اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تفصیل تو مستقل

کا مورخ بیان کرے گا۔ اور آئندہ نسلیں اس کو پڑھ کر خون کے آنسو بہائیں گی۔ یہاں تو اس صورتِ حال کی ایک جھلک صرف اس خیال سے دکھائی گئی ہے کہ ہمارے تخلیقی عمل کے راستے میں جو دشواریاں حالات نے پیدا کی ہیں ان کا تھوڑا سا اندازہ ہو سکے، اور یہ حقیقت واضح ہو کہ اس صورت حال کا ردّعمل نہایت شدید ہوا اور اسی کے نتیجے میں ادب میں تخلیقی عمل کا تسلسل رُک گیا، لیکن اس کے باوجود بعض لوگ یہ سمجھتے رہے کہ ادیب اور شاعر موجود ہیں، رسالے شائع ہوتے ہیں، کتابیں چھپتی ہیں۔ اس لیے تخلیقی عمل کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن جو کچھ گذشتہ بیس سال میں ہوا ہے اور جس کو بعض لوگ تخلیقی عمل سمجھتے ہیں، غور سے دیکھا جائے تو اس میں دو باتیں خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اہم اور چوٹی کے ادیبوں اور شاعروں نے تخلیقی عمل سے کنارہ کشی اختیار کی اور بہت سے ادیب اور شاعر تو بالکل ہی خاموش ہو گئے، اور دوسرے یہ کہ جو ادیب لکھتے رہے انہوں نے بیشتر اشاروں اور کنایوں میں بات کرنے کی کوشش کی اور وہ بھی ایک سہمے ہوئے انداز میں۔ چنانچہ اس دور میں ہر شاعر کی آواز زخمی نظر آتی ہے۔ اس میں احساسِ شکست کا کرب سنائی دیتا ہے۔ اور بعضوں کے یہاں تو یہ صورتِ حال یہاں تک نمایاں ہوئی کہ انہوں نے زندگی سے فرار کے رجحان کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ اس طرح ادب اور فن میں یا تو زندگی سے علیحدگی کا میلان رونما ہوا یا سستی لذت پسندی بےراہ روی اور فرار کی صورت میں نمایاں ہونے لگی۔ چنانچہ ادب و شعر سے ولولہ اور حوصلہ رخصت ہو گیا۔

پاکستانی معاشرے میں اس وقت عجیب و غریب حالات تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دولت کی تقسیم نہایت نامساوی ہو گئی تھی۔ بعض لوگوں نے اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس دولت کو کیا کیا جائے۔ اس کے برعکس بعض لوگ اتنے غریب ہو گئے تھے کہ زندگی ان کے لیے عذاب بن گئی تھی اور ان کے لیے جینا دشوار ہو گیا تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ان ادیبوں اور شاعروں نے، جو اس زمانے میں لکھتے رہے، ان بنیادی باتوں کی طرف بہت کم توجہ دی۔ صرف گنتی کے چند ادیبوں اور شاعروں کا نام لیا جا سکتا ہے جنہوں نے اس صورتِ حال کو محسوس کیا اور اپنی تخلیقات میں ان کی طرف اشارے کئے

طبقاتی تفریق کی یہ صورت حال دراصل ایک غلط سیاسی نظام کے نتیجے میں پیدا ہوئی جب سے یہ ملک وجود میں آیا۔ برسرِ اقتدار طبقہ سیاست کو ایک کھیل سمجھتا رہا اور خاصا عرصہ تو ایسا گذرا جب جمہوری سیاست اور سیاسی جمہوریت راندۂ درگاہ قرار دی گئی۔ ایک صاحب حکومت کے سربراہ بنے تو انہوں نے فرمایا کہ سیاسی لوگ بڑے خراب ہوتے ہیں۔ وہ مجرم ہیں۔ انہوں نے ملک کو تباہ کیا ہے۔ اور وہ پورے دس سال یہی راگ الاپتے رہے صرف اس وجہ سے کہ ان کی حکومت قائم رہے۔ غرض اس طرح منافقت، جھوٹ اور فریب نے ہی کا ماحول ہمارے معاشرے میں پیدا ہو گیا۔ اس نازک صورت حال میں ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ کوئی مثبت سیاسی اور انقلابی تحریک چلتی لیکن ہمارے ہاں اس کا فقدان رہا اور کسی وجہ سے جب کبھی اس ماحول کے خلاف کچھ ہوا بھی تو اس نے صرف ایک ہنگامے کی صورت اختیار کر لی جس کے نتیجے میں توڑ پھوڑ، لوٹ مار کا بازار تو گرم ہوا لیکن کسی نے یہ نہ سوچا کہ وہ یہ سب کچھ کس وجہ سے کر رہے ہیں، چنانچہ تخریب کا یہ میلان افراد کا مزاج بن گیا۔ خاص طور پہ نوجوانوں کے رویّے نے اس معاملے میں نہایت تشویشناک صورتیں اختیار کیں۔ ان کے یہاں ایک نراجی رجحان پیدا ہوا۔

ادیب اور شاعر تو ہمارے اس معاشرے میں پہلے ہی اداس اور سوگوار تھا اور ایک لحاظ سے اس نے زندگی سے علیحدگی اختیار کر رکھی تھی۔ جب اس کی آنکھوں نے یہ تماشا دیکھا تو وہ بالکل ہی اپنے خول میں چلا گیا اور تخلیقی عمل تقریباً بند ہو گیا۔ اس طرح ادب و فن کے تخلیقی عمل کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا اس نے بعض ایسے ادیبوں اور شاعروں کو پیدا کیا جن کے ہاں اخلاص اور صداقت کے عناصر کم تھے اور جو یا تو عادتاً یا اپنے آپ کو ادیبوں اور شاعروں کی صف میں شامل کر لینے کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ ان کے نام رسالوں میں آتے رہے اور اپنی کتابیں ان میں سے بعض خود چھپواتے رہے۔ ادب، فن اور تخلیقی عمل کی دنیا میں شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ مصنف نے اپنی تخلیقات کو خود چھاپنا اور شائع کرنا شروع کر دیا ہو۔ بہر حال معاشرے میں کوئی سیاسی اور انقلابی تحریک نہ ہونے کی وجہ سے تخلیقی عمل کی دنیا میں نہ صرف یہ کہ ایک

خلا پیدا ہوا بلکہ بڑی عجیب قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں ۔

ادب فن اور راحت کی تخلیق ایک صحت مندانہ ماحول کا تقاضا کرتی ہے ۔ وہ زندگی کی مثبت قدروں کی علم بردار ہوتی ہے ۔ اس کا پودا صرف آزادی اور محبت کی فضا میں پنپتا اور پروان چڑھتا ہے ۔ منافقت کا ماحول اس کے لیے زہر ہے ۔ بے عملی کی فضا اس کی سب سے بڑی دشمن ہے ۔ بے عقلی اور جہالت اس کے لیے ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج ممکن نہیں ۔ وہ تو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک تحریک کا مطالبہ کرتی ہے ۔ اس تحریک میں جب انقلابی رنگ و آہنگ ہو تو اس میں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں ۔ فرانس میں انقلاب سے قبل کا زمانہ ادب اور فن کے تخلیقی عمل کے لیے نہایت سازگار زمانہ تھا ۔ چنانچہ بڑے بڑے نامور شاعر اور ادیب اس زمانے میں پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی تخلیقات میں اس تحریک کو ابھارا اور اُس زمانے کے فرانس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا اور پوری طرح اس کی عکاسی کی ۔ اسی طرح رُوس میں انقلاب سے قبل کا زمانہ بھی ادب اور فن کے تخلیقی عمل کے لیے نہایت اہم ثابت ہوا اور بہت سے ایسے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے انقلابی تحریک کے زیر اثر پیدا ہونے والے حالات کو اپنا موضوع بنایا ۔ ہمارے ہاں اردو میں شاہ ولی اللہ کے زمانے سے لے کر سر سیّد اور علامہ اقبالؒ کے عہد تک جو تخلیقی عمل جاری رہا ہے وہ صرف اس زمانے میں پیدا ہونے والے عظیم مفکروں اور ان پر عمل کرنے والے مجاہدوں کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے ۔ اسی کے نتیجے میں اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے سے لے کر قیام پاکستان کی تحریک تک جو ادیب اور شاعر ہمارے ہاں پیدا ہوئے اور انہوں نے تخلیقی عمل میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ ہماری ادبی اور ثقافتی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور تہذیبی روایت میں ان کے نام ہمیشہ سنہری حروف میں لکھے جائیں گے ۔ کاش یہ صورت حال اس وقت بھی باقی رہتی ۔

اس وقت ہمارا معاشرہ ایک بحرانی دور سے گذر رہا ہے ۔ خدا خدا کر کے اس میں ایک تحریک اس وقت ضرور پیدا ہوئی ہے ۔ چنانچہ آج سیاست اور جمہوریت کی نفی کوئی

نہیں کرتا بلکہ ہر شخص جب کوئی نعرہ لگاتا ہے تو ان باتوں کو ضرور اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ طبقاتی تفریق نے جو عجیب صورتِ حال ہمارے معاشرے میں پیدا کی ہے۔ اس کا شعور بھی اب بڑھنے لگا ہے لوگ عوام کی بات بھی کرنے لگے ہیں۔ عوامی سیاست کی بات بھی سنائی دینے لگی ہے۔ اشتراکیت اور مساوات کی بات بھی اب بغیر کسی خوف اور ڈر کے کہی جا سکتی ہے۔ اب انسانیت کی بات کرنا، انسانی قدروں کے نغمے گانا، معاشرت کے تضاد کا ذکر کرنا، طبقاتی تفریق کے گھناؤنے چہرے سے نقاب اٹھانا، جدلیات کے اسرار و رموز کو سمجھنا اور ان سے لوگوں کو آگاہ کرنا، انقلاب کے قدموں کی آہٹ کو محسوس کرنا اور اس کے لیے جدوجہد کو تیز سے تیز تر کرنے کی آرزو کرنا دولت کی مساوی تقسیم کے لیے منصوبے بنانا اور مجموعی طور پر ایک نئے نظام اقدار کا خواب دیکھنا۔ یہ سب کچھ اب جرم نہیں رہا۔ اب ان باتوں کو کرنے والا کافر، ملحد اور وطن دشمن نہیں سمجھا جاتا۔ یہ نہایت خوشگوار تبدیلی ہے جو ہمارے معاشرے میں نمایاں ہوئی ہے لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس وقت ہمارا معاشرہ ایک بحرانی دور سے گزر رہا ہے۔ اس میں تعمیر کا خیال اب بھی نسبتاً کم نمایاں ہے۔ تخریب کی طرف افراد کا رجحان نسبتاً زیادہ ہے اسی لیے اس تبدیلی کے باوجود ابھی تک معاشرے میں ایک غیر یقینی کیفیت، ایک انتشار اور ایک بے چینی کا اظہار ہو رہا ہے لیکن یہی حالات اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ جلد ہی معاشرے میں ایک تحریک ایسی پیدا ہوگی جس کو انقلابی تحریک کہا جا سکے گا اور اس کے نتیجے میں جو تبدیلی ہوگی وہ یقیناً ہمارے تخلیقی عمل کے لیے ایک سازگار ماحول پیدا کرے گی۔

مشہور روسی مصنف ٹالسٹائی ToLSToy نے انیسویں صدی میں روسی معاشرے کے بارے میں یہ شکایت کی تھی کہ صدیوں سے ادب اور فن اور اس کا تخلیقی عمل اونچے طبقے کی ترجمانی کرتا رہا ہے۔ وہ اونچا طبقہ جو برسر اقتدار ہوتا ہے۔ چنانچہ عوام کے ساتھ اس کا تعلق نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔ اس نے ایک خاص طبقے کی ترجمانی کی ہے اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس کے ابلاغ اور جمالیاتی اظہار میں وہ پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں جو اس طبقے کے ساتھ مخصوص ہیں

یہ طبقہ جو طرزِ بلاغ اور جمالیاتی اظہار کے اس انداز سے ذہنی مناسبت رکھتا ہے اس لیے تخلیقی عمل کے معیاروں میں اس کی ایک جھلک نظر آتی ہے ۔ ٹالسٹائی نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اس صورتِ حال کو بدلنا چاہیے ۔ یہی بات آج ہم اپنے معاشرے اور تخلیقی عمل کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اس تخلیقی عمل میں بھی زندگی پیدا کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ عوامی طبقے کے معاملات و مسائل کو اس میں مثبت انداز سے داخل کیا جائے ۔ جب ایسا ہوگا تو اس کے اظہار اور ابلاغ میں بھی تبدیلی پیدا ہوگی اور وہ ابہام و اہمال، جو آج ہمیں اپنے تخلیقی ادب کی دنیا میں نظر آتا ہے اور جس کی وجہ سے ادب اور فن ایک چیستان بن گیا ہے ۔ ختم ہو جائے گا ۔ لیکن ایک مثبت انقلابی تحریک ہی یہ سب کچھ کر سکتی ہے ۔

ہمارا معاشرہ اور تخلیقی عمل اس صورتِ حال کو وجود میں لانے کے لیے آج جس طرح اس انقلابی تحریک کے لیے چشم براہ ہے اس سے قبل شاید کبھی بھی نہیں تھا ۔

اُردو ادب کی موجودہ صورت حال

اُردو میں آج کل ادب تو پیدا ہو رہا ہے لیکن بحیثیت مجموعی اس کا معیار تسلی بخش نہیں۔ ادب زندگی اور ماحول کی اُس وقت تک صحیح نمائندگی نہیں کر سکتا جب تک ادیب کے پاس محسوس کرنے، سوچنے اور غور کرنے کی غیر معمولی صلاحیتیں نہ ہوں۔ جب تک وہ اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے حالات سے دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ اور جب تک اس کے پاس اس بات کا شعور نہ ہو کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے قافلے کو کس منزل کی طرف جانا چاہیئے۔ آج کل ہمارے یہاں ہو یہ رہا ہے کہ بیشتر ادبی تخلیقات شدید احساس اور گہرے شعور کے نتیجے میں ظہور پذیر نہیں ہوتیں۔ ان کی بنیاد خلوص اور جذب و شوق نہیں ہے۔ اسی لیے اُن میں ایک طرح کی سطحیت کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ ادبی تخلیق کے صحیح ماحول کو پیدا نہیں کر پاتیں۔ کبھی کبھی اکا دکا ایسی تخلیقات ضرور نظر آجاتی ہیں۔ جن کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بیشتر ادبی تخلیقات میں زندگی اور جولانی کا احساس ذرا کم ہی ہوتا ہے۔

یہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ادیب نے زندگی سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو زندگی سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کا ردِّ عمل ایک فراری ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے اور یہ ذہنیت مختلف زاویوں سے آج کی ادبی تخلیقات میں اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔ اس کا اظہار کبھی تو اس شاعری میں ہوتا ہے جو

اپنے حالات کی عکاسی کی بجائے کسی خیالی دنیا کی باتیں کرتی ہے کبھی ان افسانوں میں اس کا پرتو نظر آتا ہے جو رومانی انداز میں وہ تمام باتیں پیش کرتے ہیں جن کا وجود اس دنیا میں مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ کبھی اس کی جھلک اُن ناولوں میں دکھائی دیتی ہے جو مبالغے کے ساتھ بعید از قیاس باتوں کو پیش کر کے باورائیت کی ایک فضا پیدا کرتے ہیں۔ کبھی اس تنقید میں اس کا عکس نظر آتا ہے جو کسی نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتی اور جس کا نتیجہ زندگی اور ادب دونوں میں ایک انتشار اور پراگندگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ غرض آجکل ادب کی تمام اصناف میں زندگی سے علیحدگی اور اس کے معاملات و مسائل سے چشم پوشی نے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے جس نے مجموعی طور پر ادبی تخلیق کے صحیح ماحول کو سرے سے ختم ہی کر دیا ہے۔ ادبی تخلیق کا صحیح ماحول تو اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب مختلف اصناف ادب کی بنیاد آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی کا صحیح احساس و شعور پر استوار ہو۔ اس طرح ادب میں صحت مندی پیدا ہوتی ہے اور اس صحت مندی کے ہاتھوں ادبی تخلیق کا صحیح ماحول وجود میں آتا ہے۔

آج کل ادبی تخلیق تو محض ایک رسمی سی بات ہو کر رہ گئی ہے اس کے پیچھے کوئی اہم تجربہ ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ نمود و نمائش اور سستی شہرت پسندی آجکل کے ادبی ماحول کی بنیاد ہے۔ بیشتر شاعر آج کل اس لیے شعر کہتے ہیں کہ شاعری کرنا ان کی عادت ہے، بیشتر افسانہ نگار اس لیے افسانے لکھتے ہیں کہ بعض لوگ تفریحاً اُن افسانوں کو پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کر لیتے ہیں۔ بیشتر ناول نگار اس لیے ناول لکھتے ہیں کہ وہ افراد کے لیے ذہنی طور پر فرار کا ایک ذریعہ ہے اور وہ اس کو پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی کے بعض بنیادی حقائق کو فراموش کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اُردو میں عظیم شاعری پیدا نہیں ہو رہی ہے۔ ایسے افسانوں کا وجود کم ہو رہا ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اہم اور بنیادی حقائق کی ترجمانی میں پیش پیش ہوں اور ایسے ناول نہ ہونے کے برابر ہیں جو زندگی کے نشیب و فراز کی صحیح تصویر ہوتے ہیں۔

حالانکہ آجکل کی زندگی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جن مسائل سے وہ دوچار ہے اُن کو شاعر نہ صرف محسوس کرے بلکہ غور و فکر کے ساتھ اُس کو شعر کے سانچے میں ڈھالے۔ افسانہ نگار اس طرح افسانے لکھے کہ ان گنت معاملات ان میں جگہ پاسکیں۔ اور ایسے ناولوں کی تخلیق ہو جو زندگی کے صحیح ترجمان اور عکاس ہوں۔ زندگی میں آج کل مسائل ہی مسائل ہیں۔ معاملات ہی معاملات ہیں۔ وہ ان گتھیوں کو سلجھانا چاہتی ہے۔ اُن کا حل کرنا اس کے پیش نظر ہے۔ لیکن ادیب ان معاملات و مسائل کی طرف سے چشم پوشی کر رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اُسے اول تو ان معاملات و مسائل کا علم نہیں۔ دوسرے وہ یہ نہیں جانتا کہ ان کی نوعیت کیا ہے، اور وہ کس طرح انفرادی اور اجتماعی زندگی کو متاثر کر رہے ہیں۔ وہ اس بات کا بھی شعور نہیں رکھتا کہ زندگی اب کن حالات سے دوچار ہونے والی ہے اور اُسے کون سی منزلوں سے آشنا ہونا چاہیئے اگر اس پر یہ تمام حقائق روشن ہو جائیں تو صحیح ادبی تخلیق کی طرف اس کا متوجہ ہونا لازمی ہے۔ ادبی تخلیق کا صحیح ماحول اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ادبی تنقید بڑے کارہائے نمایاں انجام دے سکتی ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد بہر حال زندگی کے صحیح احساس کو عام کرنا اور اس کے مختلف معاملات و مسائل کے شعور کو پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے پاس کچھ اصول بھی ہوتے ہیں۔ وہ کچھ معیار بھی رکھتی ہے ان اصولوں اور معیاروں کو عام کر کے وہ ادبی تخلیق کی صحیح فضا قائم کر سکتی ہے۔ لیکن آج کل کی تنقید میں تشریحی پہلو اس حد تک غالب آگیا ہے کہ وہ اپنے موضوع کی ایک صدائے بازگشت ہو کر رہ گئی ہے۔ اُس میں بصیرت کا فقدان ہے۔ وہ جب ادبی تخلیق کو اپنا موضوع بناتی ہے تو کم و بیش انہی خیالات کو دہرا دیتی ہے جو ادبی تخلیق میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ آج کل ہماری تنقید ایسے لوگوں کے ہاتھ میں پھنس گئی ہے جنہوں نے اس کی آزادی کو سلب کر لیا۔ اس میں وہ کاٹ باقی نہیں ہے جو تنقید کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس میں اب دوٹوک بات کہنے کی فضا نام کو بھی نہیں ہے۔ زندگی اور ادب تخلیق اور تنقید کے باہمی رشتے کو سمجھنا اس کا منصب نہیں رہا ہے۔ وہ تو محض تشریحی طور پر چند گھسے پٹے

خیالات کا اظہار بن کر رہ گئی ہے، جس کا مقصد صرف چند لوگوں کو خوش کرنا اور اپنی عاقبت" کو سنوارنا ہے۔

تنقید تو درحقیقت اصولوں اور معیاروں کی تنقید ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کا تعلق براہ راست زندگی سے ہوتا ہے، اور وہ بالآخر زندگی کی تنقید بن جاتی ہے۔ یہی تنقید کا صحیح منصب ہے اور جب وہ اس منصب سے آشنا ہوتی ہے تو ادبی تخلیق کا صحیح ماحول پیدا ہوتا ہے۔ اُردو ادب آج اسی تنقید کے لیے چشم براہ ہے!

پاکستانی ادب

ادب کی تخلیق، اس میں شبہ نہیں کہ کسی منصوبے کے تحت نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسا عمل ہے جس میں کسی بڑی شعوری کوشش کو دخل نہیں ہوتا۔ وہ تو دل سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے جو ایک نغمے کی طرح فضا میں گونج جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ اضطراری طور پر پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے کچھ عوامل اور محرکات ہوتے ہیں، اور ان میں خارجی حالات کے ہاتھوں پیدا ہونے والا مخصوص ماحول بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ادیب ایک جذباتی مخلوق ضرور ہے اور ادب کی تخلیق میں وہ جذبے ہی کے سہارے آگے بڑھتا ہے لیکن اس کے علم و شعور بھی اس کام میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ادبی تخلیق میں فکری گہری اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ادیب اپنے تخلیقی سفر میں علم و شعور کو اپنے لیے شمع راہ بناتا ہے۔ ایسے ہی ادیب زندگی اور ادب کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں اور اُن کی ادبی تخلیقات زندگی اور ادب دونوں میں جولانی پیدا کرتی ہیں۔

ادب کسی نقطۂ نظر اور نصب العین کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بغیر اس کی حیثیت کاغذ کے پھولوں کی سی ہو جاتی ہے یہ پھول چاہے کتنے ہی خوبصورت ہوں، ان کا اثر روح پر اچھا نہیں ہوتا۔ اُن میں خوشبو نہیں ہوتی۔ وہ دلوں کو لبھانے اور حواس پر سرخوشی بن کر چھا جانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ادب میں زندگی تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب زندگی سے اس کا خمیر اٹھتا ہے اور وہ زندگی اور اس کے معاملات و مسائل کو اپنی جولان گاہ بناتا ہے

اُس میں تو آس پاس اور گرد و پیش کے حالات کی صحیح تصویر ہوتی ہے۔ وہ تو اپنے ماحول کا صحیح آئینہ ہوتا ہے۔ اس لیے ادب میں ایران توران کی باتیں اجنبی اور نامانوس معلوم ہوتی ہیں۔ ادب کا بیج تو کسی ملک کی زمین میں پھوٹتا ہے۔ اس لیے کسی ادبی تخلیق کو اس زمین سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ادیب کے لیے اس زمین سے محبت کرنا ضروری ہے ورنہ وہ جذباتی وابستگی جو ادبی تخلیق کی محرک ہوتی ہے، پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اگر اس زمین کے ساتھ یہ جذباتی وابستگی ادیب کے یہاں پیدا نہیں ہوگی تو وہ اس کے معاملات و مسائل کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس کی زندگی میں اس محبت اور جذباتی وابستگی کے بغیر کسی اصول اور نظریے کے چراغ بھی روشن نہیں ہو سکتے، کیونکہ اصول و نظریات نصب العین اور نقطۂ نظر کی بنیاد تو اسی زمین سے محبت اور جذباتی وابستگی پر استوار ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا وجود خلا میں نہیں ہوتا۔ اسی لیے وطنیت اور قومیت کا ایک واضح تصور اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہمارے ادیب اپنی اس زمین سے محبت نہیں کرتے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ادھر ہمارے ادب میں اس زمین سے محبت کا اظہار نسبتاً کم ہوا ہے۔ یہ زمین کتنی خوبصورت ہے، اور اس کو ہم نے کس طرح بنایا اور سنوارا ہے۔ اس کے میدان کتنے حسین ہیں۔ اس کے صحراؤں میں کیسی دل آویزی ہے۔ اس کے کھیت کتنے شاداب ہیں۔ اس کے دریاؤں میں کتنی دلکشی ہے اور اس کے کوہساروں میں جلال و جمال کا کیسا حسین امتزاج ہے ۔۔ ان سب باتوں کا بیان ہمارے ادب میں آجکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ابھی تک یہ احساس [illegible] نہیں [illegible] زمین کتنی قربانیوں کے بعد حاصل کی گئی ہے۔ اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے نہ جانے کیا کیا کچھ کھو دیا ہے۔ وہ سب باتیں تو اب خواب و خیال ہو گئیں اس لیے اب نئی زندگی کا استقبال کرنا، اور اس زمین کے نئے تصوّر سے محبت کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ اس محبت کی شمع روشن ہوگی تو اس کو بنانے اور سنوارنے کا خیال بھی پیدا ہوگا اور

اس خیال کے ہاتھوں کسی واضح نقطۂ نظر اور نصب العین کی عمارت بھی تعمیر ہوگی۔ انسانی اقدار کو فروغ دینے کا خیال بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے آج کے ادب کے لیے سب سے بڑا تعمیری کام تو یہ ہے کہ اُس میں حُبِّ وطن اور قوم پرستی کا شعور عام کیا جائے تاکہ یہ زمین اور اُس کی ہر چیز دیکھنے اور محسوس کرنے والے کے لیے عزیز ہو جائے۔

ہمارے ادب میں ادھر جو انتشار رہا ہے اور جس کی حدیں ہمیں انحطاط سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں، اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ادیبوں نے اپنے آس پاس اور گرد و پیش کو بہت کم دیکھا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے آپ میں گُم ہو گئے ہیں۔ اور اس طرح ہمارے ادب میں داخلیت اور دروں بینی عام ہو گئی ہے۔ داخلیت ادب کے لیے بُری چیز نہیں لیکن اگر داخلیت اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ آس پاس اور گرد و پیش کو دیکھنے ہی نہ دے تو زندگی اور ادب دونوں کے لیے سمِّ قاتل ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ زندگی سے بیزاری، ماحول سے علٰحدگی، معاملات و مسائل سے بے تعلقی اور حقائق سے چشم پوشی کے میلانات پیدا ہوتے ہیں۔ شکست خوردگی عام ہو جاتی ہے۔ فرار پسندی کو معیار سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور جمالیاتی اظہار میں دور از کار اشاریت اور بعید از قیاس علامات کے باعث ابہام و اہمال کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال ادب کے لیے نہایت ہی نازک ہوتی ہے۔

اردو ادب بھی ادھر کچھ عرصے سے اسی صورت حال سے دوچار ہے۔ اس کا اثر ادب اور ادبی ماحول پر بہت خراب ہوا ہے۔ لوگ ادب سے گھبرانے لگے ہیں۔ کیونکہ [illegible] تخلیق [illegible] ہے، اس کا ایک بہت بڑا حصہ نئی زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ جمالیاتی اعتبار سے بھی اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو پڑھنے والوں کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ اچھے ادب کی تخلیق تو صرف مٹھی بھر آدمی کرتے ہیں اور مٹھی بھر لوگ ہی اس سے دلچسپی لیتے ہیں اس کی حیثیت وہی ہے جو صحرا میں نخلستان کی ہوتی ہے اس قسم کی ادبی تخلیقات اس طرح رونما ہوئی ہیں جیسے کہیں

گھٹا ٹوپ اندھیاریوں میں بجلی کوندتی ہے اور جس سے تاریکی کا احساس کچھ اور بھی شدید ہو جاتا ہے
آج کل ہمارے یہاں جو ادبی رسالے نکلتے ہیں، وہ اس صورتِ حال کی صحیح آئینہ داری کرتے ہیں۔ بیشتر رسالوں میں آجکل سستے قسم کا ادب چھپتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق ہی کم ہوتا ہے اور اس سے تمام رسالوں کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر رسالوں نے اپنا ایک ایسا حلقہ پیدا کر لیا ہے۔ جس میں ادبی مذاق کی پستی عام کر دی ہے اور جو سستے ادب ہی کو معیاری ادب سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان رسالوں کی اشاعت جو سستا ادب چھاپتے ہیں، معیاری ادب چھاپنے والے رسالوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ ادبی رسالے تو اب کبھی کبھی نکلتے ہیں اور ان میں اعلیٰ درجے کے تخلیقی ادب کی کمی ضخامت کے اضافے سے پوری کی جاتی ہے۔ چھپے ہوئے قدیم و جدید ادب کے انتخابات اس ضخامت کو بڑھانے کا باعث بنتے ہیں چنانچہ ایک ایک ادبی تخلیق ان رسالوں کی مختلف اشاعتوں میں کئی کئی بار چھپتی ہے۔ اس کی قیمت آٹھ دس روپے تو معمولی بات ہے۔ لیکن اس کے باوجود لوگ ان رسالوں کو خرید لیتے ہیں۔ اس لیے کہ انہیں پڑھنے سے سروکار نہیں۔ وہ انہیں سجا کر رکھنا جانتے ہیں تاکہ دیکھنے والوں پر یہ ظاہر ہو کہ ان کے پاس دولت کے ساتھ ادبی ذوق بھی موجود ہے۔ زندگی میں نمود و نمائش کے اس رجحان نے ادب اور ادبی ماحول کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ زندگی کی مخصوص کیفیت نے اس رجحان کو پڑھنے والوں میں پیدا کیا ہے۔ ادیب بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں اور ناشروں نے بھی اس کا اثر قبول کیا ہے۔ اس طرح موجودہ دور کے ادب میں ایک ایسی فضا ہوئی ہے جو کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔

آپ نے یہ ضرور محسوس کیا ہوگا کہ آج کل خالص ادبی کتابوں کی اشاعت قریب قریب بالکل ہی بند ہو گئی ہے۔ کتابیں چھپنے کا سلسلہ جاری ہے لیکن ادب کے نام سے نہ جانے کیا کیا خرافات آئے دن چھپ کر ہمارے سامنے آتی رہتی ہے۔ جنسی اور اور جاسوسی ناولوں کا بازار گرم ہے۔ تاریخی واقعات کو بھی جذباتی اور غیر فطری انداز میں

توڑ مروڑ کر پیش کرنا بھی ایک عام بات ہے۔ اور اس قسم کے ناول اور افسانے خوب چلتے ہیں۔ یا پھر عربی سے تاریخ وسوانح کے ترجمے ہوتے ہیں اور اس طرح کئی کئی سو صفحات کی کتابیں چھپتی ہیں۔ اس صورت حال نے خالص ادب کا تو گلا گھونٹ دیا ہے۔ اردو کے جو ناشر پہلے سال میں ایک ایک درجن کتابیں چھاپتے تھے۔ اب سال میں ایک ادبی کتاب بھی نہیں چھاپتے۔ بس چلنے والی کتابیں چھپتی رہتی ہیں۔ اور ان سے ناشروں کی دولت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس صورت حال سے تنگ آکر بعض ادیبوں نے اپنی ادبی کتابیں خود چھاپنے کا تجربہ بھی کیا لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ناشروں اور کتب فروشوں نے ان کی کتابوں کو پڑھنے والوں تک پہنچانے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اور اس طرح ادبی کتابوں کا چھپنا نہ چھپنا برابر ہو گیا۔

یہ صحیح ہے کہ اس صورت حال کو پیدا کرنے کی ذمہ داری صرف ناشروں پر نہیں ہے۔ پڑھنے والے بھی اس کے ذمے دار ہیں۔ ہمارے یہاں ایک تو پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بھی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اور پھر جو لوگ پڑھ لکھ جاتے ہیں، انہیں بھی پڑھنے لکھنے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ادب کے بارے میں تو وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ ہے کس چڑیا کا نام! ۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں ادب کا کوئی چرچا نہیں ہوتا۔ چھوٹے شاعر کا تو خیر کسی میں شمار نہیں۔ متوسط طبقے کے عام گھرانے میں تو میرؔ اور سوداؔ کے کلیات، غالبؔ اور مومنؔ کے دیوان، حالیؔ، اقبالؔ اور جوشؔ، جگرؔ، فانیؔ اور فراقؔ کے مجموعے اور فیضؔ اور مجازؔ اور ندیمؔ قاسمی کی کتابیں بھی بمشکل ہی ملیں گی۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں لوگ کتاب خریدنا اور پڑھنا جانتے ہی نہیں۔ ہر گھر کے بجٹ میں ہر چیز کے لیے رقم رکھی جاتی ہے لیکن پانچ روپے ادبی کتابوں کو خریدنے کے لیے نہیں رکھے جاتے۔ حالانکہ اگر یہ حقیر سی رقم کتابوں پر صرف کی جائے تو رفتہ رفتہ ایک اچھا خاصا کتب خانہ بن سکتا ہے اور اسی کے اثرات گھر کے بڑے بوڑھے، نوجوانوں اور بچوں پر اتنے مفید ہو سکتے ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اردو کی کتابیں دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت

سستی چھپتی ہیں لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم انہیں خریدتے نہیں۔ اسی لیے ہمارے مصنفوں کے دن نہیں پھرتے اور ہمارے ادب کو فروغ نہیں ہوتا۔

اگر ہم اپنے ادب کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی قوم کے بچے بچے کے دل میں ادبی ذوق کی شمع فروزاں کرنی ہوگی۔ کہ اسی طرح ادب کا حلقہ وسیع ہو سکتا ہے اور اس کی ترقی کے لیے زمین ہموار ہو سکتی ہے۔ اور یہ بات صرف ادب اور ادیبوں ہی کے فائدے کی نہیں ہے۔ پوری زندگی کا مفاد اس سے وابستہ ہے۔ کیونکہ ادب انسانیت سکھاتا ہے اور انسان دوستی کی وہ فضا اس کے ہاتھوں پیدا ہوتی ہے جو انسانیت کا طرۂ امتیاز ہے، اور جس کے لیے ہم سب ایک زمانے سے چشم براہ ہیں۔

آج حالات نے ایسی صورت اختیار کی ہے کہ اس صورت حال کو ہمارے یہاں صحیح سمجھا جانے لگا ہے۔ غیر جانب داری یا علیحدگی کی فضا اب باقی نہیں رہی ہے۔ اب لوگ ہوا میں معلّق نظر نہیں آتے۔ برخلاف اس کے تاریخی اور سماجی بنیادوں پر اپنے خیالات کی بنیادیں استوار کرنے لگے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادھر گذشتہ چند سال سے جو حالات ہمارے ملک میں پیدا ہوئے ہیں، اور سیاست نے جو جگہ ہماری زندگی میں بنائی ہے، اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ ہم سے ہر ایک سیاسی شعور کے ساتھ بات کرنے لگا ہے۔ چنانچہ اب تہذیبی اور ادبی معاملات کو سیاسی حالات کی روشنی میں دیکھنے کا مزاج ہر فرد کے ہاں نمایاں ہے۔ اب ہمارے ہم وطن خلاؤں میں نہیں رہتے۔ برخلاف اس کے زندگی کی تمام پیچیدگیوں اور کش مکش کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرتے ہیں، اور مسائل کو سلجھانے کے لیے سیاسی شعور کے ساتھ قدم اٹھاتے ہیں۔ ادب پر بھی اس کا گہرا اثر ہوا ہے۔ اب تو وہ لوگ بھی جو، چند سال قبل، ترقی پسندوں کو برا بھلا کہتے تھے اور گردن زدنی قرار دیتے تھے، وہ بھی اس بات کا دم بھرتے ہیں کہ ہماری زندگی کا تعلق سیاست سے بڑا گہرا ہے اور مساوات ہمارے معاشی مسائل کا حل ہے۔ غرض گذشتہ پانچ چھ سال کے اندر نقطہ نظر کی ایک بہت واضح تبدیلی ہماری زندگی میں رونما ہو چکی ہے۔ ذہنوں پر جو پہرے اس سے قبل بیٹھے ہوئے تھے، وہ اب موجود نہیں۔ اب ہر شخص کھل کر بات کر سکتا ہے۔ اب اس ملک میں چین، کی بات ہو سکتی ہے۔ ماوزے تنگ کو عظیم جلسوں میں خراج تحسین پیش کیا جا سکتا ہے۔

کو ربا کی باتیں ہو سکتی ہیں، اور عالم اسلام اور تیسری دنیا کے ملکوں کی یک جہتی کے لیے منصوبے بنائے جا سکتے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو موجودہ پاکستان کو اس اعتبار سے اولیت کا شرف حاصل ہے کہ اس نے تیسری دنیا کے ممالک کے سیاسی اور معاشی مسائل کو اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد بنایا۔ اس کے اثرات بڑے ہی دور رس ہوئے ہیں، اور ہماری ذہنی و فکری زندگی اس سے اس طرح متاثر ہوئی ہے کہ اب کوئی ادیب اور شاعر سیاسی شعور کے بغیر بات نہیں کرتا، طبقاتی تفریق کا احساس، طبقاتی جدوجہد کا خیال، مساوات کا خیال، ایک نئے نظام کے قیام کا شعور اور پامال اور کمزور ملکوں کی بلندی کا خیال، یہ سب باتیں آج کل جس طرح پاکستان میں ہو رہی ہیں شاید دنیا کے کم ملکوں میں ہوتی ہوں گی۔

صورت حال کی اس تبدیلی نے ہمیں نئے حالات سے دوچار کر دیا ہے۔ جدلیات کا عمل اب بھی جاری ہے اور جاری رہے گا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت ہمارے ملک کی اکثریت ترقی پسندانہ زاویۂ نظر سے زندگی اور ادب کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس صورت حال کے مثبت اثرات یہ ہیں کہ ہمارے ہاں جو ادب اس وقت تخلیق ہو رہا ہے، اس میں انسانوں کے انفرادی مسائل سے لے کر اہم اجتماعی مسائل کے گوناگوں پہلو اس کے موضوعات ہیں۔ نقطۂ نظر بیشتر کا ترقی پسندانہ ہے۔ انسانیت کی بلندی کا خیال، طبقات کی ہمواری، انسانوں کے درمیان مساوات، آزادی فکر، پامال قوموں کی سربلندی، نوآبادیاتی نظام کی خرابی، اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پاسداری، غرض یہ تمام موضوعات ایسے ہیں جو اس وقت ہماری شاعری، ہمارے افسانے، ہمارے ناول اور ہماری تنقید کے خاص میدان ہیں۔ گذشتہ چند سال میں ان موضوعات کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے اور اس صورت حال کو دیکھ کر بعض لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ آج کے اردو ادب کا مزاج مقابلتاً زیادہ سیاسی ہو گیا ہے۔ سیاست کوئی بری چیز نہیں ہے۔ صحیح سیاست تو ایک صحت مندانہ معاشرے کے قیام میں ممد و معاون ہوتی ہے اور یہی اس کا مقصد بھی ہے۔

اس وقت دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے

سامراجی سیاست اگرچہ ابھی تک اپنے پر پھیلائے ہے۔ لیکن درحقیقت اس کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ اس کی ساری عمارت اس وقت ریت پر قائم نظر آتی ہے۔ ویت نام کی جنگ میں جو کچھ ہوا، آزادی پسندی اور عوامی طاقتوں کو جس طرح کامیابی ہوئی اور سامراجی طاقتوں کو جس طرح شکست ہوئی اس نے دنیا کا نقشہ بڑی حد تک بدل دیا۔ کمبوڈیا میں جو صورت حال پیدا ہوئی اس نے سامراجی طاقتوں کا جنازہ نکال دیا۔ مجبوراً سامراجی طاقتوں نے عوامی طاقتوں کی طرف رجوع کیا اور یہ پالیسی بنائی کہ ان کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا رابطہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ چین کے ساتھ گفتگو کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا گیا۔ خوشی کی بات ہے کہ اس کام میں پاکستان نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ گذشتہ چند سال میں جو خارجہ پالیسی پاکستان نے بنائی اس کے اثرات دنیا کی سیاست پر بہت گہرے ہوئے، اور یہ صورت حال جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے درحقیقت پاکستان کی اسی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جانے لگا اور اس کی سیاسی بصیرت کی داد دی جانے لگی۔ اس کے علاوہ پاکستان نے کمزور ملکوں اور پامال قوموں کی حمایت میں وہ کچھ کیا جو دنیا کا کوئی اور ملک نہ کر سکا۔ اسرائیل کی جارحیت کی مخالفت، جنوبی افریقہ کے پامال افریقیوں کی حمایت۔ جنوبی افریقہ، نمبیا اور افریقہ کے دوسرے پامال ملکوں کی ہم نوائی پاکستان نے ہر سطح پر کی ہے اور اب بھی کر رہا ہے۔ پھر عالم اسلام کو متحد دیکھنے کا ایک خواب جو ہمارے عظیم شاعر اور مفکر علامہ اقبالؒ نے دیکھا تھا، اس کو گذشتہ چند سال میں پاکستان نے حقیقت سے قریب تر کر دیا۔ اسلامی ملکوں کی بین الاقوامی کانفرنس جو پاکستان میں ہوئی وہ اس کا بین ثبوت ہے۔ پاکستان کی کوششوں سے تمام عرب اور اسلامی ممالک ایک مرکز پر جمع ہوئے اور سر جوڑ کر اس مقصد کے لیے بیٹھے کہ عالم اسلام کے اتحاد کو ایک مستقل شکل دی جائے۔

یہ صورت حال ایسی ہے کہ ہم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ ہمارے سیاسی رہنماؤں نے قوم کو ایک ولولۂ تازہ عطا کیا ہے۔ اور ہم دنیا میں سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اس کے اثرات ہمارے ادب اور ہماری صحافت میں بھی نظر آتے ہیں۔ اب وہ شخص بھی جو آج

سے چند سال قبل سیاسی شعور کے بغیر بات کرتا تھا اگر یہ سیاسی شعور کے ساتھ بات کرتا ہے اور مثبت ترقی پسندانہ زاویہ نظر سے نہ صرف اپنے ملک کے مسائل بلکہ دنیا کے مسائل کو سامنے رکھ کر ادب کی تخلیق کرتا ہے۔ ہمارے رسالے جن میں ادب شائع ہوتا ہے اس صورت حال کی صحیح آئینہ داری کرتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک شاید آج بحیثیت تحریک اور جماعت کے زیادہ نمایاں نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جن خیالات و نظریات پر اس تحریک کی بنیاد رکھی گئی تھیں ان کے اثرات آج ہماری ادبی تخلیقات میں بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اس وقت ہمارے ادب میں علامت پسندی کا بہت زور ہے اور بیشتر ادبی تخلیقات علامت نگاری کی وجہ سے اظہار و ابلاغ کا وہ طریقہ نہیں اختیار کرتیں جو ترقی پسندوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ لیکن علامت پسندی کی تحریک تو اس وقت تمام ملکوں میں موجود ہے اور اظہار و ابلاغ میں اس سے بڑے کام لیے جا رہے ہیں۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ ایک سبب تو شاید یہ ہے کہ ادیب غیر شعوری طور پر یہ محسوس کرتا ہے کہ جو آزادی اظہار اسے نصیب ہونی چاہیے وہ اس وقت اس کو نصیب نہیں۔ بات یہ ہے کہ ادیب کبھی بھی اپنے ماحول اور معاشرے سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ خواب دیکھتا ہے رجائیت پسندی کو سینے سے لگا کر چلتا ہے۔ دوسرے ایک بات یہ بھی ہے کہ اس کے خیال میں جو بات علامتوں اشاروں اور کنایوں کے ساتھ کی جائے وہ شاید اظہار و ابلاغ کے ان طریقوں سے نسبتاً زیادہ موثر ہوتی ہے جن میں کھل کر خیالات کو پیش کیا جاتا ہے۔ پھر الفاظ کی معنویت نے بھی اس زمانے میں بے شمار صورتیں اختیار کی ہیں۔ ہر لفظ علامتوں کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس لیے ذریعہ اظہار آج کل دنیا میں علامتی ہے۔

ہمارے ہاں پاکستان میں بھی یہ صورت حال موجود ہے۔ یہاں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارا نوجوان زندگی کی جدوجہد میں ذہنی اور عملی طور پر اس طرح شریک نہیں جس طرح اسے ہونا چاہیے۔ اس کے بھی بہت سے اسباب ہیں۔ غلط نظام تعلیم، ناداری، افلاس، پریشان حالی، ذہنی انتشار، انفرادی طور پر یہ احساس کہ مستقبل میں خدا جانے

کیا ہونے والا ہے، غرض یہ تمام باتیں ایسی ہیں جنہوں نے مل کر ہمارے بہت سے نوجوانوں کو دروں بینی کا شکار کر دیا ہے اور یہی حد درجہ بڑھی ہوئی دروں بینی اس علامت پسندی کا ایک سبب ہے جو ادبی تخلیق کو ابہام کے دھندلکوں میں لپیٹ کر پیش کرتی ہے۔ اس انداز سے صحت مندی اور غیر صحت مندی کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اچھا ادب اور بُرا ادب ہر زمانے میں تخلیق ہوا ہے۔ اچھے ادیب اور بُرے ادیب ہر زمانے میں ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ادبی دنیا میں یہ صورت حال موجود ہے۔

دروں بینی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی علامت پسندی اس میں شبہ نہیں کہ ایک بین الاقوامی رجحان کی حیثیت رکھتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس صورت حال کی وجہ سے ادب کے مطالعے کا ذوق لوگوں میں کم ہوا ہے۔ جب تک عام پڑھنے والا ادب کو سمجھے گا نہیں اس وقت تک ظاہر ہے کہ وہ اس کے پڑھنے کی طرف راغب نہیں ہوگا۔ چنانچہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ جو ابہام ہمارے ہاں اظہار و ابلاغ میں اس وقت موجود ہے اس نے ادب پڑھنے کی فضا کو بڑی حد تک مجروح کر دیا ہے۔ اب وہ سنجیدہ ادب پڑھنے کی بجائے جاسوسی کہانیاں یا فلمی موضوعات سے متعلق مضامین زیادہ پڑھتے ہیں۔ غرض یہ کہ سنجیدہ ادب کی طرف توجہ نسبتاً کم ہو گئی ہے۔ شاید عام پڑھنے والے کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے، اتنا سکون بھی نہیں ہے کہ وہ ادبی گورکھ دھندوں کی طرف توجہ کریں اور ان گتھیوں کو سلجھا سکیں جو ادبی تخلیقات کی صورت میں ان تک پہنچیں۔

ذرا غور فرمائیے کہ ادب کے کتنے دشمن اس وقت غیر ارادی طور پر ادبی دنیا پر شب خون مار رہے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی وژن، غیر سنجیدہ اور غیر صحت مندانہ ماحول، زندگی کی پیچیدگیاں، بیکار قسم کی مصروفیات، تھکن، شور، ہنگامہ، رہن سہن اور ٹرانسپورٹ کا مسئلہ، گرد اور ڈیزل کا دھواں غرض یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کے درمیان ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایسے میں کس کو فرصت ہے کہ وہ ادب کی کتاب سے دلچسپی لے اور پھر جب کتاب ایسی ہو جس کو وہ پڑھ کر سمجھ بھی نہ سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ بڑی ہی نازک صورت حال ہے اور اس پر ہمیں بڑی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل ادبی دنیا سکڑ رہی ہے۔ اب ناشر ادبی کتابیں شوق سے نہیں چھاپتے، بلکہ اب تو یہ ہوگیا ہے کہ ادیب اپنی کتاب خود چھاپتا ہے یا ناشر کو پیسے دے کر چھپواتا ہے۔ کیا ان حالات میں آپ سمجھتے ہیں کہ ادب اور ادبی ماحول باقی رہ سکے گا اور کیا ادیب وہ کام کرسکیں گے جس کا تقاضا قوم، ملک تہذیب اور معاشرہ ان سے کرتے ہیں ؟

میری ناچیز رائے میں اس وقت ادب کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے حلقے کو کس طرح وسیع کیا جائے ؟ کس طرح اپنے نوجوانوں میں نظام تعلیم کے ذریعے سے ادب کا ذوق پیدا کیا جائے اور کس طرح عوام، کسانوں اور مزدوروں، کلرکوں اور عام نچلے متوسط طبقے کے لوگوں میں، طالب علموں اور استادوں میں ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا جائے۔ اس کے لیے ظاہر ہے کہ ایک منصوبہ بندی کی ضرورت ہے جس میں حکومت کے ساتھ ساتھ ہماری قوم کے ہر فرد کو شریک ہونا چاہیئے۔ نظام تعلیم میں ادب کے صحیح ذوق کو عام کرنے کا منصوبہ تو ظاہر ہے کہ حکومت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، لیکن گھروں میں، دفتروں میں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں ادبی ذوق کو پھیلانا اور عام کرنے عام افراد کا فرض ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں گھروں کا جو بجٹ ہوتا ہے اس میں کتاب خریدنے کی کوئی مد نہیں ہوتی۔ ہم مسلمان ہیں لیکن دینی کتاب تک ہمارے گھروں میں خریدی نہیں جاتی۔ میر اور غالب کے کلام کو خریدنے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اول تو اس طرح کی ادبی کتابیں مناسب قیمتوں پر اچھی طرح چھپی ہوئی بازار میں ملتی نہیں، کتب فروش انہیں لوگوں تک پہنچاتا نہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ جو لوگ ادبی کتابوں کو خریدنا بھی چاہیں تو وہ ایسی ادبی کتابوں کو خرید نہیں سکتے۔ پھر جو استاد بچوں کو پڑھاتا ہے، جو ماں باپ بچوں کی پرورش کرتے ہیں انہیں ادب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ تو بغیر سوچے سمجھے اپنے یہ فرائض پورے کرتے ہیں۔ یہ ادب اور تہذیب کے لیے بڑی ہی بھیانک صورت حال ہے۔ اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہم ادبی ماحول کو کس طرح پیدا

کر سکتے ہیں اور اپنے اس ادبی حلقے کو کس طرح وسعت دینے کا منصوبہ بنا سکتے ہیں؟
اس کے بغیر ادب کے فروغ اور ادبی تخلیق کی ترقی کا خیال ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

ادیب اور موجودہ ادبی صورت حال
ادیبوں کے مسائل
پاکستانی معاشرہ اور ادیب

ادیب اور موجودہ ادبی صورتِ حال

اُردو کا ادیب ایک عظیم تہذیبی و ثقافتی روایت کا علم بردار ہے، اور یہ تہذیبی و ثقافتی روایت اُس کی تخلیقات کے آئینے میں پوری طرح بے نقاب نظر آتی ہے۔ اس روایت کو اپنے ارتقائی سفر میں جن حالات سے دوچار ہونا پڑا اور زندگی کے انفرادی اور اجتماعی معاملات نے اس کو جس طرح متاثر کیا ہے، اُردو کے ادیب نے زندگی کے ہر دور میں اُس کی صحیح مصوّری کی ہے۔ وہ ہمیشہ آزادی کا علمبردار اور اخوت کا پرستار رہا ہے۔ اُس کے سیاسی اور سماجی شعور نے اِن منزلوں سے ہمکنار ہونے کے لیے ہمیشہ آگے کی طرف قدم بڑھائے ہیں۔ اس نے ہمیشہ ترقی پسند اور ترقی پذیر قدروں کی پرستش کی ہے، اور پھیلتی اور بڑھتی ہوئی زندگی کا ساتھ دیا ہے۔ اس نے انسانی محبت کے گیت گائے ہیں اور اقدارِ خیر کے نغمے سُنائے ہیں۔ اس نے زندگی کی کشمکش اور آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی آواز زندگی کے ہر دَور میں ہماری زندگی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔

آزادی کے بعد بھی اُردو کے ادیب نے اپنی اس روایت کو برقرار رکھا۔ اُس نے آزادی کا استقبال کیا۔ اس کی محبت کے نغمے گائے۔ آزادی کے ساتھ اس نے ایک نئے نظام کا خواب بھی دیکھا۔ زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی آرزو بھی کی۔ کیونکہ وہ آزادی کو انہیں تمام باتوں سے عبارت سمجھتا تھا۔ وہ اس کے لیے جدوجہد کرتا رہا، اور اسی جدوجہد کو اُس نے زندگی سمجھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مخصوص حالات بھی اس کے سامنے رہے جو آزادی کے

کے بعد زندگی میں پیدا ہوئے اور وہ ان حالات میں خون کے آنسو بھی بہاتا رہا۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ جس معاشرے سے اس کا تعلق تھا، اس کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ اُس کے بہت سے لوگ اُس سے علحدہ ہو کر رہ گئے ہیں اور اس کو ان کی کچھ خبر نہیں۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ چنانچہ اُس نے اس المیے کی تصویر کشی کی۔ اِس کے علاوہ ایک دوسرا المیہ یہ ہوا کہ خوابوں کے جو رنگ محل اُس نے تعمیر کیے تھے وہ زمین پر آ رہے۔ آرزوں اور تمناؤں کی جو شمعیں اس نے فروزاں کی تھیں، اُس کو ناساز گار حالات کے تھپیڑوں نے بجھا دیا، اور اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کی زندگی تاریک راہوں میں بھٹک رہی ہے۔ منزل کی صورت اُسے نظر نہیں آتی۔ اس صورت حال نے زندگی میں جس شکست خوردگی کو عام کیا، اُردو کے ادیب نے اس کی ترجمانی بھی کی۔ لیکن وہ زندگی سے مایوس نہیں ہوا۔ اس نے مستقبل سے اُمیدیں وابستہ کیں اور زندگی کے منت پذیر شانہ گیسوؤں کو سلوارنے کا اہم کام انجام دیا۔ ———— یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے افق پر چھائی ہوئی اندھیاریوں میں روشنی کی ایک مشعل نظر آتا ہے۔

گذشتہ چند سال میں اس کے آس پاس اور گرد و پیش جو تماشے ہوتے رہے ہیں ان سب کو اس نے بہت غور سے دیکھا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ زندگی عجیب و غریب حالات سے دوچار ہے اِس میں کوئی تحریک باقی نہیں رہی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے پر ایک بے حسی کا عالم طاری ہو گیا ہے۔ افراد زندگی کی بنیادی قدروں سے بالکل ہی بے نیاز ہو گئے ہیں۔ معیاروں کا خیال سرے سے باقی ہی نہیں رہا ہے۔ کسی نقطۂ نظر اور نظریہ حیات کی صورت دُور دُور تک نظر نہیں آتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ افراد انجان راہوں پر بھٹک رہے ہیں اور انہیں کچھ خبر نہیں کہ اُن کی زندگی کا قافلہ کون سی منزل کی طرف گامزن ہے۔ دولت کو لوگوں نے اپنا نصب العین بنا لیا ہے اور اُس کے حصول کی خاطر وہ نہ جانے کیا کیا کچھ کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا ماحول ادیب کے لیے ساز گار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں تو زندگی اس کے لیے دوبھر ہو جاتی ہے اور وہ مر مر کے جینے کی کوشش کرتا ہے۔ اُردو کے ادیب نے اس ماحول میں زندہ رہنے کی کوشش تو کی ہے لیکن وہ اس ماحول کے لیے اجنبی

ہوگیا ہے۔ اُس پر حیرت اور پریشانی طاری ہوگئی ہے۔ اس حیرت اور پریشانی کے عالم میں اُس نے بہت کچھ کہنا چاہا ہے لیکن جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا وہ سب کچھ کہہ نہیں سکا ہے۔ بعضوں پر تو حالات کچھ اس طرح انداز ہوئے ہیں کہ انہوں نے خاموشی ہی اختیار کرلی ہے اور جنہوں نے کچھ کہا ہے اُن کی آواز کسی لق ودق صحرا میں گونجی ہوئی سی آواز معلوم ہوتی ہے۔

زندگی کی اس صورتِ حال نے اُردو کے ادیب کو کئی خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ آج کل کچھ ادیب تو ایسے ہیں جو اپنے آپ کو ادیب ظاہر کرتے ہیں۔ نمود و نمائش ان کا شیوہ ہے تکلف و تصنع اُن کا شعار ہے۔ یہ لوگ اُلٹی سیدھی چیزیں لکھ کر ادیبوں کی صف میں اپنی جگہ بنانے کے خواہشمند ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ادیبوں کی تحریروں میں کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ وہ تو محض شہرت حاصل کرنے کے خیال سے وجود میں لائی جاتی ہیں۔ اسی لیے ان میں تخلیقی رنگ و آہنگ کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ان کے ساتھ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے آجکل ادب کو محض تفریح کے خیال سے اختیار کیا ہے۔ یہ زندگی اور اس کے دھاروں سے بے خبر ہیں، اور ایک ایسے گنبد میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں جہاں نہ تو کوئی آواز پہنچتی ہے اور نہ وہاں سے کوئی آواز آتی ہے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے منصوبوں کو برقرار رکھنے کے لیے ادب کا دامن تھاما ہے اور اس کو اپنی عزت اور شہرت کا ذریعہ اور وسیلہ بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب کی تخلیق ایسے لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ ان کے علاوہ آج کل بعض لکھنے والے ہمارے یہاں ایسے بھی ہیں جو آس پاس اور گرد و پیش کے ناساز گار حالات کو دیکھ کر دروں بینی کی حد تک داخلیت پسند ہوگئے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں اور ان میں اپنے آس پاس اور گرد و پیش کو دیکھنے کی سکت باقی نہیں رہی ہے۔ ان پر تو ایک بے حسی کا عالم طاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ ان کی تحریروں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ میں گم ہیں اور صرف اپنے لیے لکھ رہے ہیں۔ زندگی سے انہیں کوئی سروکار نہیں رہا ہے۔ ان ادیبوں کی تحریریں ذہنی الجھنوں کا پشتارہ ہیں، اور ان میں ابہام و اہمال کی فراوانی ہے۔ ان کے مقابلے میں تھوڑے سے ادیب ایسے ہیں جن کو صحیح معنوں میں ادیب کہا جا

جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے سامنے زندگی اور اُس کا ایک واضح نقطۂ نظر ہے۔ وہ زندگی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ادب میں زندگی اور زندگی میں ادب کی رمق آج انہیں کے دم سے نظر آتی ہے۔ ادیبوں کا یہی طبقہ آج ہمارے ادب کی صحیح نمائندگی کرتا ہے اور انہیں کی تحریریں زندگی پر چھپائی ہوئی بے حسی کی اس تاریکی میں چراغ راہ اور شمع محفل کا کام کرتی ہیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ادیبوں کا یہ طبقہ آج کل ذرا محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ یوں اس طبقے سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کی تعداد تو خاصی ہے لیکن ان میں سے بیشتر نے آج کل یا تو لکھنا کم کر دیا ہے یا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ ان کے نہ لکھنے یا کم لکھنے کے اسباب تو کئی ہیں لیکن بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے ادب میں آج کل کوئی باقاعدہ تحریک باقی نہیں رہی ہے۔ زندگی میں پیدا ہونے والے عجیب و غریب حالات نے ادبی تحریکوں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اور ادیب بغیر کسی صحیح تحریک اور صحت مند ادبی فضا کے بھی لکھ رہے ہیں۔ اس لیے آجکل کبھی کبھی تو لکھنے والوں کی معیاری تحریریں دیکھنے میں آجاتی ہیں لیکن ان تحریروں کا تسلسل آج کل قائم نہیں رہا ہے۔ جب زندگی اور ادب میں تحریکیں موجود ہوں تو ادیب جوش اور ولولے کے ساتھ لکھتے ہیں ہمارے یہاں جب یہ صورتِ حال موجود تھی تو ادیب جوش اور ولولے سے لکھتے تھے اور انہوں نے اپنی تحریروں سے ادبی تخلیق کا ایک سلسلہ بھی قائم کر رکھا تھا۔ اسی لیے ادب اور ادیب دونوں میں زندگی نظر آتی تھی، لیکن جب سے ان تحریکوں کا خاتمہ ہوا ہے اردو کے بیشتر ادیب کچھ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں جیسے انہیں زندگی اور ادب دونوں سے کوئی دلچسپی ہی باقی نہیں رہی ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ ادیب ان حالات کو دیکھ کر حیرت سے انگشت بدنداں ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے عجیب و غریب تماشے ہو رہے ہیں۔ وہ ان تماشوں کو دیکھ تو رہا ہے لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچا ہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں کسی بڑی ادبی تخلیق کا وجود میں آنا تو درکنار، ادبی تخلیق کا تسلسل بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ لیکن انہیں حالات کی زمین میں کسی تحریک کا بیج بھی پھوٹتا اور کسی بڑی ادبی تحریک کا ہیولا بھی تیار ہوتا ہے۔ ہمارے ادب میں بھی آج اس کے آثار نظر آتے ہیں اور ادب، ادیب اور ادبی صورتِ حال کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ گھٹا تو چھا چکی ہے، بس اب مینہ برسنے ہی والا ہے۔

ادیبوں کے مسائل

ابراہیم کاملے ABRAHM COWLEY نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کسی ایسے زمانے میں جو اپنے اندر جنگ کی سی کیفیت رکھتا ہو۔ اور جس میں حزن ویاس اور رنج و الم کی فراوانی ہو، وہ لکھنے کے لیے تو بہت اچھا زمانہ ہوتا ہے، اور لکھنے والے اس کے بارے میں اچھی طرح لکھ بھی سکتے ہیں لیکن اس زمانے میں رہ کر لکھنا بدترین بات ہے۔ کیونکہ ایسے زمانے میں لکھنے والے کے لیے زیست مشکل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی انفرادیت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس کے سامنے ان گنت موضوعات ہوتے ہیں۔ وہ ان موضوعات کو اپنی تخلیقات میں پیش بھی کرتا ہے۔ اعلیٰ درجے کی تخلیقات بھی اس کے ہاتھوں وجود میں آتی ہیں۔ لیکن خود اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ مرمر کے جیتا ہے، اور جینے کی کوشش میں مرجاتا ہے۔ وہ زندوں میں نہیں رہتا۔ اس لیے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی ہمت اس میں باقی نہیں رہتی۔ وہ تھک کر بیٹھ جاتا ہے۔ زندگی کی بساط پر اس کی ہستی مات کھا جاتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو اجنبی بے یار و مددگار اور بے مونس و دمساز سمجھ کر اس سے بیزار ہو جاتا ہے۔ کسی چیز میں اس کے لیے دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ اس کی دنیا میں بعض عجیب وغریب معاملات ومسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ کوئی اس کو اپنا نظر نہیں آتا۔ کسی چیز میں اس کو بوئے انس نہیں ملتی۔ زندگی اس سے اس بات کا تقاضا تو کرتی ہے کہ وہ لکھے، حالات اس سے اس بات کی توقع تو رکھتے ہیں کہ وہ اپنے تخلیقی عمل کو جاری رکھے۔ لیکن اس کے ساتھ

ہمدردی کسی کو نہیں ہوتی۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اس کو زندہ رہنے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ان چیزوں کو کس طرح فراہم کیا جا سکتا ہے؟

ہمارے ادیبوں کا بھی آج کل کچھ ایسا ہی حال ہے۔ جن حالات میں سے ہو کر اُن کی زندگی کا قافلہ گذر رہا ہے، وہ حد درجہ ناساز گار حالات ہیں۔ ان کے آس پاس اور گردو پیش ہنگامہ ہے، انتشار ہے، افراتفری ہے، نفسی نفسی کی کیفیت ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے ادبی تخلیق سے منہ نہیں موڑا۔ لیکن ان حالات میں خود ان کا جو حال ہوا ہے، اس کی تفصیل بڑی ہی دردناک ہے۔ ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی ہے، انہیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا ہے۔ کوئی شخص بھی ان کو خاطر میں نہیں لاتا۔ معاشرے میں ان کی کوئی عزت اور وقعت باقی نہیں رہی ہے بلکہ بیشتر لوگ تو ایسے ہیں جو انہیں ایک بے کار مخلوق سمجھتے ہیں جن کے خیال میں اُن کی ذات اور اس کے کام کا کوئی مقصد نہیں غرض یہ کہ سماجی نظام میں ادیبوں کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ اُن سے ادبی تخلیق کا تقاضا تو کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے بنیادی معاملات و مسائل سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ بلکہ ادھر کچھ عرصے سے تو ہمارے ماحول میں ادیبوں کے بارے میں کوئی سوچتا ہی نہیں۔ جیسے ان کے کوئی مسائل ہی نہیں کیسی عجیب بات ہے کہ ادب کے مسائل پر تو ہمارے ماحول میں غور و فکر کا سلسلہ جاری ہے لیکن ادیبوں کے مسائل کو کوئی خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ادب کے مسائل سے زیادہ اہمیت تو ادیبوں کے مسائل کو حاصل ہونا چاہیئے۔ ادیب بہر حال ادب کے خالق ہیں۔ ان کا وجود نہ ہو تو ادب کا کوئی تصوّر پیدا ہی نہیں ہوتا اس لیے ادب اور ادبی مسائل کے مقابلے میں ادیبوں کے مسائل کی طرف توجہ کہیں زیادہ ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ ادیبوں کے مسائل صرف ان کی ذات ہی تک محدود نہیں، ان کا اثر ادبی تخلیق پر بھی ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل کی رفتار بہر حال ان مسائل کی پابند ہوتی ہے۔ آج جو ہماری ادبی زندگی میں ایک تعطل سا نظر آتا ہے اور ایک ویرانی سی دکھائی دیتی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ادیب اپنے ذاتی معاملات اور انفرادی مسائل میں اس بُری طرح اُلجھے ہوئے ہیں کہ انہیں ادبی تخلیق کی طرف پوری طرح توجہ

کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ گذشتہ چند سال ہماری زندگی میں ایسے گذرے ہیں جب ہر شخص دولت حاصل کرنے کے لیے ایک دوڑ دوڑتا رہا ہے، چاہے وہ کسی طرح سے حاصل کی جائے۔ اس صورت حال نے اعلیٰ قدروں اور ارفع معیاروں کا احساس زندگی سے مٹا دیا۔ بس دولت ہی کو لوگ معیار سمجھنے لگے۔ ظاہر ہے ان حالات میں زندگی کے ذہنی اور روحانی پہلوؤں کی طرف توجہ عام نہیں ہو سکتی۔ اچھے ادب کا بازار اسی وجہ سے سرد ہوا ادیب نے اس ماحول کو اپنے لیے اجنبی سا محسوس کیا۔ اور وہ خود اس ماحول کے لیے اجنبی سے ہو گئے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ خود اپنے جی کو اجنبی سے لگنے لگے ہیں۔ ہر لمحہ انہیں یہ خیال گزرتا ہے کہ صحیح ادبی تخلیق کا ماحول ان کے معاشرے میں باقی نہیں ہے۔ اچھے ادب کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اس لیے ان کی پذیرائی نہیں ہوتی۔ اول تو ادب سے کسی کوئی سروکار نہیں رہا ہے اور اگر کسی کو سروکار ہے بھی تو ایسے ادب سے ہے جس کو ادب کہا ہی نہیں جاتا۔ اس صورت حال نے ادیب کو معاشرے سے الگ کر دیا ہے۔ وہ ذہنی طور پہ اس ماحول سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اسی لیے اس معاشرے میں اس کو اپنے لیے کوئی باعزت جگہ نظر نہیں آتی۔ اور اس کے اعصاب پہ اس صورت حال کا بڑا اثر ہے۔

ادیب کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی حیثیت کو تسلیم کرانا ہوتا ہے۔ مادی معاملات ہی کو وہ سب کچھ نہیں سمجھتا۔ مادّی ترقی ہی اس کے پیش نظر نہیں ہوتی۔ دولت کی اس کو ضرورت نہیں۔ جاہ و منصب کی وہ تمنا نہیں کرتا۔ شہرت کی آرزو اس کے لیے سب کچھ نہیں ہوتی وہ ان تمام باتوں سے بلند ہوتا ہے۔ خودداری اس کی سب سے بڑی دولت ہے۔ خدمت کو وہ سب سے بڑا منصب سمجھتا ہے۔ انسان دوستی اس کا نصب العین ہوتی ہے۔ اس کا خمیر ان ہی عناصر سے اُٹھتا ہے۔ اسی لیے اس کی دنیا میں معیار مختلف ہوتے ہیں جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے وہ مادی پہلوؤں کو اہمیت نہیں دیتا۔ اس کی دنیا تو احساس اور جذبے کی دنیا ہوتی ہے وہ اسی دنیا میں مست رہتا ہے۔ اسی لیے اس کی مسرّتیں بہت ہی سادہ اور معصوم ہوتی ہیں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہوتا ہے اگر اس سے کوئی سیدھے

منہ بات کرے تو وہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے اس کو دنیا کے خزانے مل گئے۔ اگر اس کے کام کی اہمیت محسوس کی جاتی ہے تو اسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ بن گیا۔ اگر اس کو مقبولیت نصیب ہوئی۔ اور لوگوں نے اس سے صحیح دلچسپی کا اظہار کیا تو اُسے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کو حیات ابدی مل گئی۔ اس لیے ادیب ایک ایسے معاشرے کا تقاضا کرتا ہے جو صحت مند بنیادوں پہ قائم ہو۔ جس میں انسانیت ہو۔ انسانی اقدار کا خیال ہو۔ جو عزت کرنا جانتا ہو۔ جو دل کو ہاتھ میں لے سکتا ہو، ادیب ایسے ہی ماحول میں کھُلتا ہے۔ اسی فضا میں اس کی مخصوص صلاحیتیں اپنے خول سے باہر نکلتی ہیں۔ تخلیقی کام کا فروغ اس ماحول کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ ماحول پیدا ہو جائے تو ادیب کی عزت بڑھتی ہے اس کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے اس کو بہت سی آزادیاں نصیب ہوتی ہیں۔ اس میں سب سے بڑی آزادی تو اس کی انفرادی اور ذہنی آزادی ہے۔ ادیب کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوپر کسی طرح کی پابندی کو عائد نہیں کر سکتا۔ اس کی فطرت کسی قسم کے احتساب کو گوارا نہیں کر سکتی۔ وہ آزاد ہوتا ہے۔ اس کو دنیا کی کوئی طاقت پابہ زنجیر نہیں کر سکتی۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ جو چاہتا ہے سوچتا ہے۔ جو اس کے جی میں آتا ہے اس کا اظہار کرتا ہے۔ جو چیزیں اس کو پسند ہیں بہت ممکن ہے دنیا میں کوئی بھی ان کو پسند نہ کرتا ہو۔ اس کے دل میں کسی ایسی جگہ رہنے کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے جہاں کسی کو پہنچنے کا خیال تک نہ آئے۔ کچھ ایسی حرکات اس سے سرزد ہو سکتی ہیں جن کو لوگ اچھا نہ سمجھتے ہوں۔ وہ اپنی حیثیت ایسی بنا سکتا ہے جو عام لوگوں کی حیثیت سے مختلف ہو۔ اس کا لباس بھی مختلف ہو سکتا ہے۔ رہن سہن کا طریقہ بھی مختلف ہو سکتا ہے۔ اس کی خواہش بھی مختلف ہو سکتی ہے۔ اس کی آرزوئیں اور تمنائیں بھی مختلف ہو سکتی ہیں بغرض یہ کہ وہ راہ ورسم عام سے ہٹ کر چلتا ہے۔ جب اس طرح اس کی زندگی میں ایک انفرادیت قائم ہو جاتی ہے تب کہیں اس کو ذہنی سکون نصیب ہوتا ہے یہی ادیب کی مسرت ہے۔ یہ مسرت اس کو مل جائے تو وہ تخلیقی کام کی طرف خاطر خواہ توجہ کر سکتا ہے۔ ورنہ اس کی صلاحیتیں

گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے پاس ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پر دم نکلتا ہے اس کے ارمان بہت نکلتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کم نکلتے ہیں۔ اس کا دل غم کھانے میں بہت بودا ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے غم کی ایسی موجیں اس کی زندگی میں اٹھتی ہیں جس سے اس کی زندگی ڈانواڈول ہو جاتی ہے۔

ہمارا معاشرہ ادیب کے اس مزاج کو نہیں سمجھتا۔ وہ عام افراد اور ادیبوں کو ایک لاٹھی سے ہانکتا ہے۔ اسی لیے یہاں ادیب کا زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہاں ادیب کو ہر لمحہ اپنی آزادی کا خون کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ادیب کو اس معاشرے میں کوئی منفرد مقام حاصل نہیں۔ ادیب کو اگر یہ مقام حاصل ہو جائے تو اس کا اثر اس کے تخلیقی کام پر ہوتا ہے۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ ادیب کی پوری زندگی اور اس زندگی کے تمام پہلو اس کے تخلیقی کام سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ فرض کیجئے ایک ادیب کی خواہش یہ ہے کہ کچھ عرصے کے لیے کسی ایسے مقام پر جا کر رہے جو اس کی جائے قیام سے ایک ہزار میل دُور کسی ایسی جگہ واقع ہے جہاں جانا اور جا کر قیام کرنا بغیر اربابِ اختیار کی مدد کے ممکن نہیں۔ حالانکہ اگر اس کو وہاں جانے کا موقع مل جائے تو وہ کوئی بہت اچھا تخلیقی کارنامہ پیش کر سکتا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں ادیب کے لیے ایسی سہولتیں حاصل نہیں۔ اگر وہ وہاں جانے کے لیے اربابِ اختیار کو توجہ دلائے تو ایک عام انسان کی درخواست کی طرح اس کی درخواست بھی ردّ کر دی جائے گی۔ ایسی ہی بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں۔ دنیا میں آج ایسے ملک موجود ہیں جہاں ادیبوں کی ان خواہشات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اگر ادیب کسی خاص مقام پر جانے کی خواہش کا اظہار کرے یا خاص طرح پر رہنے کا خیال ظاہر کرے تو اربابِ اختیار اس کے لیے تمام آسانیاں فراہم کریں گے تاکہ چھوٹی سی بات اس کے تخلیقی کام کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔

ہر ادیب کو اپنی انفرادیت عزیز ہوتی ہے۔ اس انفرادیت کا اس کی تنہائی کے ساتھ بڑا تعلق ہے۔ ادیب کے آس پاس اور گرد و پیش اس تنہائی کا ایک اثاثہ ہوتا ہے۔ اس کے بغیر وہ ایک ادیب کی طرح زندہ نہیں رہ سکتا۔ البتہ ایک آدمی کی طرح ضرور جی

سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ صرف ایک آدمی کی طرح بٹ گئے تو پھر ادب سے اس کا کوئی سروکار نہیں رہے گا۔
اس لیے ادب کی تخلیق کرنے کے لیے اس کو یہ تنہائی درکار ہے۔ یہ تنہائی نہ ہو تو تخلیق کا ماحول پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کے یہاں تخلیق کی تحریک ہو ہی نہیں سکتی۔ اس تنہائی میں وہ اپنے احساسات کو سمیٹتا ہے۔ اپنے جذبات کو ترتیب دیتا ہے۔ اپنے شعور کو یکجا کرتا ہے۔ اور اس طرح اس کے موضوعات کی ترکیب کے سامان فراہم ہوتے ہیں۔ لیکن اس تنہائی کا مطلب سماجی زندگی سے علیحدگی نہیں ہے کیونکہ ادیب بہرحال سماج کا ایک فرد ہوتا ہے اور اس سے علیحدگی اختیار کر کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس ماحول میں رہ کر بھی اس کے لیے ایک ماحول چاہیئے۔ جس میں وہ اپنے آپ کو پا سکے۔ اسے ذہنی آسودگی نصیب ہو۔ اس کے پاس ایک مانوس ماحول ہو جس میں وہ اپنے خیال کے مطابق زندگی کے دن گزارے۔
ہمارے معاشرے نے یہ ماحول ادیب کو نہیں دیا۔ موجودہ ماحول میں وہ تنہائی اس کو نصیب نہیں ہے۔ جس کی ہر ادیب کو تمنا ہوتی ہے۔ اور جو اس کے لیے ضروری بھی ہے۔ آج تو ادیب کو چھوٹی چھوٹی باتوں سے دست و گریباں رہنا پڑتا ہے۔ اس کی بات بات پر انگلیاں اٹھتی ہیں۔ اس کی ایک ایک حرکت کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسی لیے اس ماحول میں اس کو موانست کا احساس نہیں ہوتا۔ اور پھر سمند ناز پر ایک تازیانہ یہ ہے کہ اسے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے خدا جانے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ وہ پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کے لیے دفتروں میں کلرکی کرتا ہے۔ ڈاک خانوں میں خطوں پر مہریں لگاتا ہے۔ اخبار کے دفتروں میں ترجمے کرتا ہے۔ فلم کمپنیوں میں عجیب و غریب قسم کے گیت اور مکالمے لکھتا ہے اور جو ادیب یہ سب کچھ نہیں کرتا، یا نہیں کرنا چاہتا تو اس کو ناشروں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ جیسی کتابیں وہ لکھنا چاہتا ہے ناشر کو ان سے دلچسپی نہیں۔ اس لیے اس کو ترجمے کرنے پڑتے ہیں۔ یا کسی ایسے موضوع پر کتابیں لکھنی پڑتی ہیں جن سے اس کو کوئی طبعی مناسبت نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے جب ادیب ان الجھنوں میں گرفتار ہوگا تو اس کو وہ تنہائی تو نصیب نہیں ہو سکتی جس کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ اور جس کے بغیر ادبی تخلیق کے وجود

میں لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

یہ تخلیقی فضا ہمارے ادب سے رخصت ہوگئی ہے۔ اور ادیب آج کل ذہنی طور پر پریشان حال ہے۔ اس لیے نہیں کہ مادّی اعتبار سے اس کو سکون میسّر نہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ تخلیقی فضا سے دور ہو گیا ہے۔ اور یہ بڑی ہی نازک صورت حال ہے۔ ہمارے ادب میں جمود کا نعرہ بہت عام ہے۔ اگر کوئی ادیب چند سال نہ لکھے تو اس پر لے دے شروع ہو جاتی ہے اور ہر شخص اس کی تن آسانی کا شکوہ کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ پھر تقاضے الگ ہوتے رہتے ہیں کہ ادیب کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔ وطن پرست ہونا چاہیئے۔ مملکت کا وفادار ہونا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بے چارے ادیب کی کوئی نہیں سنتا۔ یہ سب فروعی باتیں ہیں کہ ادیب کو کیا لکھنا چاہیئے۔ اور کس خیال کی نشرواشاعت کرنی چاہیئے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ادیب کو لکھنے اور سوچنے کے لیے یکسوئی کی ضرورت ہے۔ یہ یکسوئی ہمارا معاشرہ اس کو کس حد تک فراہم کرتا ہے۔ ادیب وطن پرست ہوتا ہے۔ اس کی وفاداری میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس کی ترقی پر بھی کوئی حرف نہیں رکھ سکتا۔ وہ سماج کا بہت ذمہ دار فرد ہوتا ہے۔ اور اس قسم کے تمام تقاضے اس کے ہاتھوں پورے ہوتے ہیں۔ وہ ان حدود سے باہر رہ کر کسی اور خیال کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ بعض لوگ ادیب کی سیاسی آزادی اور فکری آزادی پر بہت زور دیتے ہیں۔ یہ باتیں ضمنی ہیں۔ ادیب کے غور و فکر کا گلا کون گھونٹ سکتا ہے۔ انسانیت کی تاریخ میں آج تک تو اس کی آزادی پر حرف آیا نہیں۔ جہاں اس آزادی کو چھیننے کا خیال پیدا ہوا وہاں لوگوں کو منہ کی کھانی پڑی۔

اس لیے ادیبوں کے مسائل کا صحیح حل اس وقت ایسے ماحول کو پیدا کرنا ہے جہاں ادیب کو ادیب سمجھا جائے۔ اس کو ایک ادیب کی طرح باعزت طریقے سے رہنے کا موقع دیا جائے جہاں اس کو اپنے مزاج کے مطابق ادبی تخلیق کی طرف خاطر خواہ توجہ کرنے کا موقع میسّر آئے۔ اور جہاں اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر نہ رہ جائے۔

پاکستانی معاشرہ اور ادیب

ادب اور ادیب کا تعلق اپنے معاشرے اور قاری سے بڑا گہرا ہوتا ہے۔ دراصل ادب کی تخلیق کی تحریک پڑھنے والے کی مخصوص کیفیت کی مرہون منت بھی ہوتی ہے۔ ہال بروک جیکسن نے اپنی کتاب (ریڈنگ آف بکس) میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ اور مفید بحث کی ہے۔ پاکستانی ادیبوں کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ اس کے معاشرے کا انتشار اور ادیب کے ساتھ اس کے قاری کی بے نیازی ہے۔ آج پاکستانی معاشرے میں ادیب کو وہ مقام حاصل نہیں جو ہونا چاہیئے تھا۔ اور پڑھنے والوں کا یہ حال ہے کہ انہوں نے ادب اور ادیب کے ساتھ اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔

پاکستانی معاشرے کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں ایک مادّی زاویۂ نظر ادھر گذشتہ چند سال سے بہت عام ہوگیا ہے اور زندگی کے جذباتی، روحانی اور ذہنی معاملات سے لوگوں کو دلچسپی باقی نہیں رہی ہے۔ ہر شخص اپنی مادّی ضرورتوں کو پورا کرنے، زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے، اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مادی وسائل کو مہیا کرنے کی فکر میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ اس لیے زندگی کی لطیف چیزوں کا احساس معاشرے میں باقی نہیں رہا ہے۔ برخلاف اس کے ایک طرح کی سفاکی کا دور دورہ ہے اور یہ سفاکی اس مادی زاویۂ نظر کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے جس سے اس وقت ہمارا معاشرہ دوچار ہے۔ یہ صورت حال اعلیٰ قدروں کے احساس و شعور کو مٹا دیتی ہے اور زندگی کے لطیف پہلوؤں کے احساس کو پس منظر میں ڈال دیتی ہے۔ افراد کا رویّہ بہیمانہ صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ پاکستانی معاشرے کا یہ بہت بڑا

المیہ ہے جس کا اثر ادبی تخلیق پر بھی ہوا ہے۔

اس معاشرے میں صحیح ادب پڑھنے والوں کی تعداد اس لیے محدود ہو کر رہ گئی ہے کہ انہیں نہ تو ان معاملات سے کوئی دلچسپی ہے جو اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیقات کا موضوع بنتے ہیں اور نہ انہیں اتنی فرصت ہی ہے کہ وہ اس قسم کے معاملات سے دلچسپی لیں جن کی نوعیت ذہنی اور روحانی ہے۔ چنانچہ اعلیٰ تخلیقی ادب کو پڑھنے والے اس وقت ہمارے معاشرے میں بہت ہی کم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اعلیٰ ادب پڑھنے والوں کی تعداد ہر معاشرے میں بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن اتنی محدود بھی نہیں ہوتی جتنی اس وقت ہمارے معاشرے میں ہے۔

زندگی کے مادّی زاویہ نظر نے افراد میں ایک طرح کا فراری رجحان عام کر دیا ہے اور وہ زندگی اور اس کی حقیقتوں سے بھاگ کر ایسی باتوں سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں جو انہیں تھوڑی دیر کے لیے زندگی سے بے خبر کر دیں۔ چنانچہ ایسے ادب کی طرف رجحان نسبتاً زیادہ ملتا ہے جس کی نوعیت تفریحی ہے یا جو ایک ایسا ہیجان پیدا کرتا ہے جس سے انسان تھوڑی دیر کے لیے زندگی سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ یہ جو جاسوسی ادب آج کل زیادہ پڑھا جاتا ہے یا ڈائجسٹوں میں جو کچھ چھپتا ہے اور جس کو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے جو اوپر واضح کی گئی ہے۔

اس صورت حال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعلیٰ معیاری ادب کا ماحول ہمارے ہاں باقی نہیں رہا۔ ادب کے طالب علموں تک میں یہ رجحان گذشتہ چند سال میں بہت کم رہا ہے۔ اور اس طرح دیکھا جائے تو اعلیٰ تخلیقی اور معیاری ادب سے دلچسپی افراد میں نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے بیشتر رسالوں نے دم توڑ دیا۔ ادبی کتابوں کی طباعت و اشاعت محدود ہو کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ ادیبوں اور شاعروں کے تخلیقی عمل کی رفتار بھی سست پڑ گئی اور اس طرح ادیبوں کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس نازک اور سنگین صورت حال کی طرف جیسی توجہ ہونی چاہیے تھی وہ نہیں کی گئی۔ کبھی کبھی ادیب اس کا رونا روتے رہے ہیں۔ لیکن کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ان حالات میں تبدیلی کس طرح پیدا

کی جائے اور حالات کو کس طرح معمول پر لایا جائے۔

اس عالم میں پاکستانی ادیبوں نے تقریباً تیس سال گزارے ۔ اس عرصے میں جو ستم انہیں اٹھانے پڑے ہیں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ناسازگار معاشرتی ماحول، غیر مستحکم سیاسی فضا، تہذیبی انتشار، معاشی ناہمواری، افراد کی بے نیازی ان سب نے مل کر ادیبوں کو گویا معاشرے سے خارج ہی کر دیا۔ اور پھر سمندناز پر ایک اور تازیانہ یہ ہوا کہ معاشرے میں اس قسم کی دلچسپیاں پیدا ہوگئیں، جن کی وجہ سے ادب پڑھنے کا وقت ہی لوگوں کے پاس نہیں رہا۔ مثلاً گذشتہ دس سال سے ٹیلی ویژن ہمارے ملک میں آگیا اور اس نے وہ لمحے ادیبوں سے چھین لیے جن میں وہ خود تخلیقی کام کرتے تھے اور ان کے قاری ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے خارجی عوامل ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے ادب کے قاری کو بے شمار دوسرے مسائل میں الجھا دیا۔ یہاں تک کہ اسے نہ ادب پڑھنے کی فرصت رہی اور نہ اس کے لطیف پہلوؤں کو سمجھنے کا دماغ باقی رہا چنانچہ غیر شعوری طور پر ادیبوں نے تخلیقی عمل سے ایک طرح کی علٰحدگی اختیار کی۔ کیونکہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے سامنے ان کا قاری نہیں ہے۔ معاشرے میں ان کی پذیرائی ممکن نہیں۔ اور معاشرے میں ان کا کچھ کہنا دیواروں سے سر ٹکرانے کے مترادف ہے۔

اگر یہ بات کہی جائے کہ معاشی ناہمواری کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورت حال ادیب کو بھی متاثر کرتی ہے اور اس کا اثر اس کے تخلیقی عمل پر ہوتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ ناہموار معاشی حالات میں ادیبوں نے بھی ادبی تخلیق کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر ادیب کے پاس سر چھپانے کے لیے جگہ نہ ہو، معاشرے میں اس کو کوئی مقام نہ دیا جائے، وہ بھوکا مرنے لگے، اسے مستقبل میں روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آئے تو ظاہر ہے کہ وہ خاطر خواہ ادبی تخلیق کو جاری نہیں رکھ سکتا۔ آخر ادیب بھی بہرحال ایک انسان اور معاشرے کا فرد ہوتا ہے۔ معاشرہ اس سے اعلیٰ ادبی تخلیق کا تقاضا تو کرتا ہے لیکن اس کی زندگی کے جو بنیادی تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے

کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ گذشتہ بیس پچیس سال سے ہمارے معاشرے میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ادیب عام طور پر عملی انسان نہیں ہوتا۔ وہ خیال کی دنیا بساتا ہے، تخلیقِ جمال میں گم رہتا ہے۔ وہ دنیاوی مسائل کے مادی پہلوؤں کو عام انسان کی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ نہ ان کو حل کرنے کے لیے عملی طور پر اقدام کرنے کی صلاحیت اس میں ہوتی ہے۔ اس کے لیے تو معاشرے کی طرف سے کچھ سہولتیں چاہیئں۔ اسے تو یہ احساس چاہیئے کہ معاشرے میں اُس کا کوئی مقام ہے۔ اس کو تو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ معاشرے میں اُس کی کوئی اہمیت ہے اور اس کی زندگی کے بنیادی تقاضے پورے ہو رہے ہیں۔

ہمارے معاشرے نے ادیب کے لیے یہ سب کچھ نہیں کیا۔ چنانچہ اس کے ہاں بھی معاشرے کی طرف سے ایک طرح کی بے نیازی پیدا ہوئی۔ یہ کوئی اچھی بات نہ تھی۔ اس کے نتیجے میں اس نے فرار اختیار کیا۔ وہ اپنے خول میں چلا گیا اور اتنا مبہم ہو گیا کہ اس کی بات مشکل سے سمجھ میں آئی۔ اور اس طرح ایک ایسا چکر شروع ہو گیا جس نے ادبی ماحول کو مسموم اور ادیب کے کردار کو ڈانواں ڈول کر دیا۔ اس عرصے میں ہمارے معاشرے میں کوئی ایسی ذہنی و فکری تحریک پیدا نہ ہو سکی جو ادیب کے لیے مہمیز کا کام کرتی۔ اس معاشرے میں تو انفعالیت کا دور دورہ رہا۔ اس ماحول میں بھلا ادب کیسے پنپ سکتا ہے اور ادیب کس طرح اپنے کام کو جاری رکھ سکتا ہے؟۔

ادھر چند سال سے ہمارے معاشرے میں کتاب کا چھاپنا اور منظرِ عام پر لانا ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ طباعت اور کاغذ کی گرانی نے ہوشربا صورت اختیار کر لی ہے۔ ناشروں نے اعلیٰ تخلیقی ادب کا چھاپنا تقریباً بند کر دیا ہے۔ کیونکہ اس سے انہیں کوئی مالی فائدہ نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب بہت سے ادیب اپنی کتابیں خود چھاپنے لگے ہیں۔ ظاہر ہے جن کتابوں کو ادیب خود چھپوائے گا وہ معاشرے میں کس طرح پھیل سکیں گی۔ اگر ان کی مانگ ہوتی تو ظاہر ہے کہ خود ناشر اس کو چھاپتے لیکن ناشر جانتا ہے کہ اعلیٰ تخلیقی ادب کا ماحول محدود ہے ایک ہزار کتاب پانچ دس برس میں نکلتی ہے۔ اس

لیے اب وہی ادیب کتابیں چھپوا سکتے ہیں جن کے پاس کچھ وسائل ہیں یا جنہیں اپنی کتاب چھپوانے کا شوق ہے۔

یہ ادب اور ادیب کے لیے بڑی ہی سنگین صورت حال ہے۔ کاش ہمارا معاشرہ، ہماری حکومت۔ اور ہم سب ادیبوں کے ان مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کر سکتے اور ان کو حل کرنے کا کوئی باقاعدہ منصوبہ بنا سکتے۔!

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادب وتنقید لاہور ۵

افسانہ
اور
افسانے کی تنقید

○

مصنف

ڈاکٹر عبادت بریلوی

○

موضوعات

○

—— مختصر افسانے کا فن —— ناول، ناولٹ اور طویل مختصر افسانہ —— ناول کے نئے رجحانات —— اردو افسانے کا ارتقار —— اردو افسانوں میں حقیقت نگاری —— منٹو کی حقیقت نگاری —— قرۃ العین حیدر —— کرشن چندر احمد ندیم قاسمی —— انتظار حسین —— جیلانی بانو ——

○

—— ناشر ——

ادارہ ادب وتنقید لاہور

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادب وتنقید لاہور ۲

رہ نوردانِ شوق

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی،
رئیس المتغزلین حضرت جگر مُرادآبادی اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

کے

شخصیتوں کے مرقعے

مصنف
ڈاکٹر عبادت بریلوی

ناشر

ادارۂ ادب وتنقید لاہور

سلسلہ مطبوعات ادارۂ ادب وتنقید، لاہور ۲

○

ادب

اور

ادبی قدریں

○

مصنّفہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی

○

اس کتاب میں مندرجۂ ذیل موضوعات پر تنقیدی زاویۂ نظر سے اظہار خیال کیا گیا

—— ادب کیا ہے ؟ —— ادب کی بنیادی قدریں —— ادبی تخلیق
ادب میں اسلوب کا مسئلہ —— ادب اور عوام —— ارتقائی اد
ادبی تخلیق میں تجربے کی اہمیت —— ادب ادیب اور تاریخی شعور ——
—— کلاسیکی ادب، کا مطالعہ —— ادب کا مستقبل ——

○

—— ناشر ——

ادارۂ ادب وتنقید ، لاہور

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادب و تنقید لاہور ۶

تنقید

اور

اصولِ تنقید

مصنف

ڈاکٹر عبادت بریلوی

موضوعات

—— تنقید کیا ہے؟ —— ادبی تنقید کے بنیادی اصول —— رومانی تنقید —— تنقید کے نئے دبستان —— تحقیق و تنقید —— اردو میں تنقید کی روایات —— اردو تنقید میں نئے تجربے —— حالی کی تنقید —— شبلی کی تنقید —— آزاد کی تنقید —— میراجی کا تنقیدی شعور ——

ناشر

ادارۂ ادب و تنقید، لاہور

سلسلہ مطبوعات ادارۂ ادب وتنقید لاہور ۳

آوارگانِ عشق

ـــ شاعرِ شہر نگاراں اسرار الحق مجاز ـــ ثناء اللہ خاں میراجی ـــ

ـــ ناصر کاظمی ـــ پروفیسر محمد حسن عسکری ـــ پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

کے

شخصیتوں کے مرقعے

مصنف

ڈاکٹر عبادت بریلوی

7380

ناشر

ادارۂ ادب وتنقید، لاہور